قرآن فہمی بذریعہ خط و کتابت کورس

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع !

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں

1) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لئے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے' مزید برآں 44 آڈیو کیسٹ کے سیٹ کی صورت میں اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی اعانتی مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔

2) عربی گرامر خط و کتابت کورس (I' II' III)

قرآن و حدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لئے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

3) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لئے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کیلئے درج ذیل پتے پر رجوع کریں!

ناظم شعبہ خط و کتابت کورس

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون : 03-5869501

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد: ۵۱

شمارہ: ۴

صفر المظفر ۱۴۲۳ھ

اپریل ۲۰۰۲ء

فی شمارہ ۱۲/-

(اس شمارے کی قیمت ۲۰ روپے)

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

☆ اندرون ملک	125 روپے
☆ ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	800 روپے
☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1000 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36-کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 03-02-5869501

فیکس: 5834000 ای میل: anjuman@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67-گڑھی شاہو علامہ اقبال روڈ، لاہور

فون: 6316638-6366638 فیکس: 6305110

ای میل: markaz@tanzeem.org

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

✿ **عرض احوال** ——— ۳

حافظ عاکف سعید

✿ **ظروف و احوال** ——— ۷

ملکی وملی مسائل پر امیر تنظیم اسلامی کا اظہارِ رائے

✿ **تذکرہ و تبصرہ** ——— ۹

پاکستان میں اسلام اور سیکولرزم کی کشمکش — ڈاکٹر اسرار احمد

✿ **واقعہ کربلا** ——— ۳۷

حقائق وواقعات کی روشنی میں — مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

✿ **پاکستان اور عدلیہ کی آزادی** ——— ۴۷

ریاض الحسن نوری

✿ **اسلامی نظام خلافت ضروری کیوں؟** ——— ۵۴

محبوب الحق عاجز

✿ **حکمت دعوت** ——— ۶۶

قرآنی راہنمائی واسوۂ رسولؐ — فرحت عزیز

✿ **دعوت و تحریک** ——— ۷۷

اسلامی احیائی تحریکوں کی ناکامی کے اسباب — مولانا سید وصی مظہر ندوی

✿ **اولی الناس بابراھیم** ——— ۹۰

محمد منیر احمد

✿ **ھماری دعوت** ——— ۹۵

تعارف ودعوت تنظیم اسلامی — ڈاکٹر منظور حسین

✿ **منھاج المسلم** (۲۱) ——— ۱۰۴

نفس کے آداب — علامہ ابوبکر الجزائری

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

عرض احوال

قرارداد مقاصد اور دستورِ پاکستان

پاکستان میں دستور سازی کی تاریخ بہت دردانگیز ہے۔ قرارداد مقاصد تو اگرچہ ۱۹۴۹ء میں ہی منظور کر لی گئی تھی لیکن پہلا باقاعدہ دستور قیامِ پاکستان کے ۹ سال بعد ۱۹۵۶ء میں بنا' جو بدقسمتی سے ''حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے'' کا مصداق ثابت ہوا۔ بعدازاں خدا خدا کر کے مزید ۱۷ سال بعد ۱۹۷۳ء میں قوم کو ایک متفقہ دستور میسر آیا' لیکن اسے بھی بہت جلد موم کی ناک بنا دیا گیا۔ وقفے وقفے سے لگنے والے مارشل لاؤں نے بھی اگرچہ اس دستور کی حیثیت کو مشکوک بنانے میں شرمناک کردار ادا کیا لیکن ملکی سیاسی تاریخ میں اب بھی اس آخری سہارے کے طور پر اسی دستور کا سہارا لیا جاتا اور اسی کو ملکی بقا کا ضامن گردانا جاتا ہے ــــ تاہم ۱۲/اکتوبر کے سانحے کے نتیجے میں بننے والی عبوری حکومت کو چونکہ سپریم کورٹ نے دستور پاکستان میں ترمیم ایسے نازک اختیارات بھی مرحمت فرما دیئے ہیں' جبکہ اس حکومت کا واضح رجحان عریاں سیکولرازم اور اباحیت پرستی کی جانب ہے' لہٰذا دستور پاکستان میں شامل قرارداد مقاصد اور دیگر اسلامی دفعات کا مستقبل غیر یقینی اور مخدوش دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ دنوں اسی تناظر میں یہ بحث طبقۂ دانشوراں میں چل نکلی کہ ''کیا قرارداد مقاصد پاکستان کے سیاسی و مذہبی کردار کو معین کرنے کی اہلیت رکھتی ہے؟''

ہمارے نزدیک قرارداد مقاصد نہ صرف یہ کہ پاکستان کے سیاسی کردار کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق معین کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے بلکہ قیامِ پاکستان کے مقاصد کے حوالے سے وطن عزیز کی منزل اور ہدف کو بھی صحیح رخ میں معین کرنے کی موجب ہے۔ قرارداد مقاصد کی حیثیت دستور پاکستان میں روح کی سی ہے کہ جس کے بغیر ہمارا جسد ملی ایک بے جان ڈھانچے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ موجودہ حکومت

کے پیش نظر آئینی ترامیم کا اگر کوئی ایسا پیکیج ہے کہ جس کے لئے قرارداد مقاصد اور دیگر اسلامی دفعات کو دستور سے لفظی یا معنوی طور پر کھرچنا مقصود ہے تو ہمارے نزدیک یہ ایک بہت بڑا قومی المیہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس کے نتیجے میں پاکستان کا وہ اسلامی تشخص معدوم ہو جائے گا کہ جو اس کی واحد وجہ جواز اور بقاء واستحکام کی واحد ٹھوس اساس ہے۔ روزنامہ جنگ کے زیر اہتمام مذکورہ بالا موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ان کی افادیت کے پیش نظر ذیل میں ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے کہ ان میں نہ صرف یہ کہ قرارداد مقاصد کی حیثیت کے حوالے سے ہماری رہنمائی کا بہت کچھ سامان موجود ہے بلکہ موجودہ دستور میں ان ضروری ترامیم کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے کہ جس کے ذریعے قرارداد مقاصد کو بہتر طور پر روبعمل لانا ممکن ہوگا:

''جب پاکستان وجود میں آیا تو اس وقت دنیا میں قومی ریاست کے تصور کا ڈنکا بج رہا تھا۔ پاکستان اسی تصور کی نفی کی بنیاد پر قائم ہوا۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ تحریک پاکستان ایک قومی ریاست کی تشکیل کی تحریک تھی۔ تحریک پاکستان دراصل ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے محض ایک الگ ریاست کے قیام کی تحریک ہی نہ تھی بلکہ اس میں احیائے اسلام کا جذبہ بھی شامل تھا جسے علامہ اقبال نے اس تحریک میں شامل کیا۔ یہ اقبال ہی تھے جنہوں نے وطنی قومیت کی نفی انتہائی زوردار انداز میں کی تھی ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

اقبال نے ہی برطانیہ میں جا کر قائداعظم کو قائل کیا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت کا بیڑا اٹھائیں ورنہ قائداعظم تو مایوس ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ علامہ اقبال نے انہیں قائل کیا تھا کہ یہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کا قومی مسئلہ نہیں بلکہ یہ امت مسلمہ کا مسئلہ بھی ہے اور احیائے اسلام کی امیدیں اس سے وابستہ ہیں۔ چنانچہ قائداعظم اسی جذبے کے تحت واپس آئے اور مسلمانوں کی قیادت کا بیڑا اٹھایا۔ اسی لئے تحریک پاکستان میں نعرہ لگا

''پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ''۔ قرارداد مقاصد جو قیام پاکستان کے دو سال بعد ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو منظور ہوئی، اصل ہندوستان کے مسلمانوں کے اسی جذبے اور امنگوں کی ترجمان اور عملی اظہار ہے۔

آج جدید تصور ریاست میں حاکمیت اعلیٰ Sovereignty کا جو تصور ہے اسے یہ قرارداد واضح انداز میں پورا کرتی ہے۔ اس قرارداد میں اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ پاکستان کے عوام کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ ایک مقدس امانت ہیں جو اللہ کی معین کردہ حدود کے اندر ہی استعمال ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح آج دنیا میں جدید تصورات کے حوالے سے آزادی (Freedom)' مساوات (Equality) اور اخوت (fraternity) کی اصطلاحات معروف ہیں' اس قرارداد کے ان الفاظ میں بڑی عمدگی سے ان اصطلاحات کا احاطہ کیا گیا ہے کہ پاکستان میں جمہوریت' آزادی' مساوات' رواداری اور عدل اجتماعی کے ان اصولوں کی پوری پابندی کی جائے گی جو اسلام نے معین کئے ہیں' بس فرق یہ ہے کہ یہ اصول اسلامی حدود کے پابند ہوں گے یعنی مادر پدر آزاد نہیں ہوں گے۔

اسی طرح یہ خیال کرنا بھی درست نہیں کہ قرارداد مقاصد صرف مذہبی طبقے کے خوف سے منظور کی گئی اور پاکستان میں شیعہ' سنی فرقہ واریت یا دیگر مذہبی اختلافات کی موجودگی میں اس کے ذریعے کسی متفقہ نظام کا تعین ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگلے ہی سال یعنی ۱۹۵۰ء میں تمام فرقوں اور مسلکوں کے ۳۱ سربرآوردہ علماء نے ملک کے اسلامی دستور کی تشکیل کے لئے متفقہ بائیس اصول دیئے۔ ان علماء میں شیعہ' سنی' دیوبندی' بریلوی' غرض ہر مکتبہ فکر کے علماء شامل تھے۔ چنانچہ ملک کے پہلے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ایوب خان جو ۶۲ء کے آئین میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے الفاظ میں سے لفظ ''اسلامی'' نکالنے پر مصر تھے' مذہبی طبقے کے دباؤ پر نہیں بلکہ تحریک پاکستان کے حقائق اور عوامی امنگوں کے باعث ہی اپنی اس خواہش کی تکمیل نہ کر سکے۔ یہی وہ عوامی جذبات تھے جن کی بناء پر ذوالفقار علی بھٹو جیسے سیکولر ذہن کے مالک حکمران کو ۷۳ء کے آئین میں قرارداد مقاصد کی روشنی میں اسلامی دفعات شامل کرنا

ملکی وملی مسائل پر امیر تنظیم اسلامی کا اظہار رائے

مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں خطابات جمعہ کے پریس ریلیز

(۱)

بھارتی مسلمانوں کا قتل عام اور ہماری بے حسی

یکم مارچ ۲۰۰۲ء کا خطاب جمعہ

ایودھیا کی بابری مسجد کے بارے میں ہندوؤں کا دعویٰ سراسر غلط اور تاریخی حقائق کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ بابری مسجد کے حوالے سے بھارت میں حالیہ فسادات کے دوران وہاں کے مسلمانوں پر بہت کڑا وقت آیا ہے لہٰذا ہمیں دعا کرنی چاہئے کہ بھارت کے مسلمانوں پر سے یہ سخت آزمائش جلد ختم ہو۔ اگرچہ بھارت کے مسلمان کمزور نہیں لیکن ہندو مسلم فسادات کے موقع پر پولیس کی ہندوؤں کی درپردہ پشت پناہی اور خاموش تماشائی کا رول ادا کرنے کے باعث مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان زیادہ ہوتا ہے۔

۱۹۹۲ء میں ایودھیا کی بابری مسجد کے حوالے سے پیدا ہونے والی صورت حال کم وبیش وہی ہے جو مشرق وسطیٰ میں مسجد اقصیٰ کی ہے۔ جیسے بھارت میں رام مندر کی تعمیر کے حوالے سے ہندوؤں کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے اسی طرح اسرائیل کے انتہا پسند یہودی بھی مسجد اقصیٰ اور گنبد صخریٰ کو گرا کر ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف اس وقت یہود و ہنود گٹھ جوڑ پورے عروج پر ہے۔ تاہم یہودیوں نے اگر بزور قوت کوئی شرارت کرنا چاہی تو مشرق وسطیٰ میں جنگ کی وہ بھٹی دہک جائے گی جس کی لپیٹ میں پورا عالم آ جائے گا۔ یہی وہ جنگ ہے جسے احادیث میں الملحمۃ العظمیٰ اور بائبل میں آرمیگاڈان کہا گیا ہے۔

صدر مشرف ملک کو سیکولرائز کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی جگہ ایک محب وطن سپاہی ہیں لیکن انہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ ملک کو سیکولرازم کی طرف لے جانے کی کوئی کوشش اس کے وجود کے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہوگی کیونکہ اس صورت میں ملک کے علیحدہ وجود کا جواز ختم ہو جائے گا۔ افسوس تو یہ ہے کہ ملک کی سرحدوں پر دس لاکھ بھارتی فوج جمع ہے اور پاکستان کا دشمن ایڈوانی پاک بھارت کنفیڈریشن کی باتیں کر رہا ہے لیکن ہماری اخلاقی حالت یہ ہے کہ بسنت کے تہوار پر کروڑوں کی فضول خرچی کی گئی اور بے شمار جانوں کے ضیاع کے باوجود ہماری

پڑیں اور اس قرارداد کو آئین کے دیباچے میں رکھا گیا۔

جہاں تک اقلیتوں کے حقوق کا تعلق ہے اس قرارداد کی رو سے انہیں اپنے عقیدے، عبادت اور پرسنل لاز کے معاملے میں مکمل آزادی حاصل ہوگی۔ اسی طرح انہیں تجارت اور ملازمت کے یکساں مواقع حاصل ہوں گے۔ چونکہ یہاں قانون سازی صرف قرآن وسنت کے دائرے کے اندر ہی ہو سکے گی لہٰذا قانون ساز اداروں یا ملک کے ایسے اعلیٰ عہدوں پر جن کا تعلق ملک کے دفاع، پالیسی یا خفیہ معاملات سے ہو، غیر مسلموں کا تقرر نہیں کیا جا سکے گا۔ نیز اس قرارداد کے مطابق اقلیتوں کا تعین مذہب کی بنیاد پر ہوگا۔

دراصل یہ ایک عالمی سازش ہے جس کے ذریعے پاکستان کو سیکولرازم کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ اسی سازش کے تحت قائد ملت لیاقت علی خان کو قتل کرایا گیا اور بعد ازاں گورنر جنرل غلام محمد نے ۱۹۵۴ء میں دستور یہ کی بساط ہی لپیٹ دی تھی تاکہ اس سمت میں ہونے والی پیش رفت کو روکا جا سکے۔

اسلام کے مطابق غیر خدا کی حاکمیت کفر وشرک ہے۔ جبکہ قرارداد مقاصد میں اسلامی دستور کا ایک اہم تقاضا ''حاکمیت الٰہی کا اقرار واعتراف'' پورا کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرارداد اسلامی نظام خلافت کے تقاضے پورا کرتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ چونکہ تحریک پاکستان کا مومینٹم اس قرارداد کی بنیاد تھا اور یہ قرارداد مکمل طور پر پاکستان کے سیاسی و مذہبی نظام کا تعین کرتی ہے اس لئے اسے درست طور پر دیباچے سے نکال کر آئین کا حصہ بنایا گیا ہے۔ تاہم یہ ہماری بدقسمتی رہی ہے کہ ہم ابھی تک اپنے ملک کا نظام اس کی روح کے مطابق استوار نہیں کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دستور میں جہاں قرارداد مقاصد اور دیگر اسلامی دفعات موجود ہیں وہاں آئین میں ایسے چور دروازے بھی موجود ہیں جو مختلف النوع ابہام پیدا کرنے کا موجب ہیں اور یوں ہمارا آئین ایک گورکھ دھندا بن کر رہ گیا ہے۔ اس ضمن میں اگر دستور میں درج ذیل ترامیم کر دی جائیں تو ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا حقیقی سفر شروع ہو سکتا ہے اور اس طرح یہ ملک اپنی اصل منزل کی طرف مثبت طور پر اپنے سفر کا آغاز کر سکتا ہے:

(باقی صفحہ ۱۱۹ پر)

ملکی وملی مسائل پر امیر تنظیم اسلامی کا اظہار رائے

مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں خطابات جمعہ کے پریس ریلیز

(۱)

بھارتی مسلمانوں کا قتل عام اور ہماری بے حسی

یکم مارچ ۲۰۰۲ء کا خطاب جمعہ

ایودھیا کی بابری مسجد کے بارے میں ہندوؤں کا دعویٰ سراسر غلط اور تاریخی حقائق کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ بابری مسجد کے حوالے سے بھارت میں حالیہ فسادات کے دوران وہاں کے مسلمانوں پر بہت کڑا وقت آیا ہے لہٰذا ہمیں دعا کرنی چاہئے کہ بھارت کے مسلمانوں پر سے یہ سخت آزمائش جلد ختم ہو۔ اگرچہ بھارت کے مسلمان کمزور نہیں لیکن ہندو مسلم فسادات کے موقع پر پولیس کی ہندوؤں کی در پردہ پشت پناہی اور خاموش تماشائی کا رول ادا کرنے کے باعث مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان زیادہ ہوتا ہے۔

۱۹۹۲ء میں ایودھیا کی بابری مسجد کے حوالے سے پیدا ہونے والی صورت حال کم وبیش وہی ہے جو مشرق وسطیٰ میں مسجد اقصیٰ کی ہے۔ جیسے بھارت میں رام مندر کی تعمیر کے حوالے سے ہندوؤں کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے اسی طرح اسرائیل کے انتہا پسند یہودی بھی مسجد اقصیٰ اور گنبد صخریٰ کو گرا کر ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف اس وقت یہود و ہنود گٹھ جوڑ پورے عروج پر ہے۔ تاہم یہودیوں نے اگر بزور قوت کوئی شرارت کرنا چاہی تو مشرق وسطیٰ میں جنگ کی وہ بھٹی دہک جائے گی جس کی لپیٹ میں پورا عالم آ جائے گا۔ یہی وہ جنگ ہے جسے احادیث میں الملحمۃ العظمیٰ اور بائبل میں آرمیگاڈان کہا گیا ہے۔

صدر مشرف ملک کو سیکولرائز کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی جگہ ایک محب وطن سپاہی ہیں لیکن انہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ ملک کو سیکولرازم کی طرف لے جانے کی کوئی کوشش اس کے وجود کے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہوگی کیونکہ اس صورت میں ملک کے علیحدہ وجود کا جواز ختم ہو جائے گا۔ افسوس تو یہ ہے کہ ملک کی سرحدوں پر دس لاکھ بھارتی فوج جمع ہے اور پاکستان کا دشمن ایڈوانی پاک بھارت کنفیڈریشن کی باتیں کر رہا ہے لیکن ہماری اخلاقی حالت یہ ہے کہ بسنت کے تہوار پر کروڑوں کی فضول خرچی کی گئی اور بے شمار جانوں کے ضیاع کے باوجود ہماری

آنکھیں نہ کھلیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے یہی روش جاری رکھی تو وہ دن دور نہیں کہ جب خود اپنے ملک کے اندر سے بھارت کے ساتھ کنفیڈریشن کی آوازیں اٹھنا شروع ہو جائیں گی کہ اگر اسلام صرف نماز، روزے کا نام ہے تو اس کی اجازت تو بھارت میں بھی ہے لہٰذا الگ ملک کے قیام کی کیا ضرورت ہے؟ اس خوفناک صورت حال سے بچنے کا راستہ یہی ہے کہ ہم ملک میں اسلام نافذ کر دیں۔ لہٰذا ہمیں اللہ سے دعا کرنی چاہئے کہ وہ پرویز مشرف کے دل کو بدل دے تاکہ وہ سیکولرازم کی طرف جاری اس سفر کو روک کر ملک میں اسلام کا نظام قائم کریں اور ملک تباہی سے بچ جائے۔

(۲)

چرچ پر حملہ اور عطاء الرحمٰن ثاقب کا قتل

نائب امیر تنظیم اسلامی کا ۲۲ مارچ ۲۰۰۲ء کا خطاب جمعہ

اسلام آباد میں چرچ پر حملہ اور لاہور میں معلم قرآن و عربی زبان عطاء الرحمٰن ثاقب کے قتل میں اس بات کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا کہ یہ واقعات ملک و قوم کے خلاف کسی گہری سازش کا شاخسانہ ہوں۔ اسلام آباد کے حساس ترین علاقے میں واقع ایک چرچ پر دن دیہاڑے دستی بموں کے حملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی مسلمان کی کارروائی نہیں ہو سکتی کیونکہ ملک میں مسلمان تنظیموں کی عیسائیوں سے کسی پرخاش کے آثار دور دور تک نہیں پائے جاتے۔ اس واقعہ کو طالبان یا القاعدہ کی انتقامی کارروائی قرار دینا بھی بعید از قیاس ہے۔ واقفانِ حال یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ مذہبی فرقہ واریت کی آڑ میں دہشت گردی کا کھیل دراصل اسلام دشمن عالمی طاقتیں کھیل رہی ہیں جن میں را اور موساد سرفہرست ہیں۔ اسی طرح اسلام آباد کے اس واقعے میں امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کے ملوث ہونے کے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو پاکستان کے اندرون معاملات میں امریکی مداخلت اور عمل دخل کو مزید موثر بنانے کے لئے کوشاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس واقعہ کے فوراً بعد امریکہ کا یہ موقف سامنے آیا کہ اب ہم پاکستان کے ساتھ مل کر یہاں سے دہشت گردی کو ختم کریں گے۔ اس بات سے امریکہ کی یہ خواہش بالکل عیاں ہے کہ ایف بی آئی کا عمل دخل پاکستان میں ہر ادارے اور ہر سطح پر ہو۔ اگر حکومت وقت نے امریکی چال کو نہ سمجھا اور ان کی مرضی کے مطابق انہیں فری ہینڈ دیا تو اس کا دوسرا قدم یہ ہوگا کہ دہشت گردی کے اس جیسے مزید واقعات کے ذریعے حکومت کو ناکام قرار

(باقی صفحہ ۱۰۳ پر)

تذکرہ و تبصرہ

پاکستان میں اسلام اور سیکولرزم کی کشمکش

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

جس وقت پاکستان عالم وجود میں آیا پوری دنیا میں سیکولرزم کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اور دین و مذہب اور ریاست و سیاست کی علیحدگی کا عمل پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا ـــــ چنانچہ یہ بات بطورِ اصول موضوعہ طے ہو چکی تھی کہ مذہب کا تعلق انسان کی صرف انفرادی زندگی سے ہے اور اس کے اعتبار سے ہر شخص پوری طرح آزاد ہے کہ جو مذہب چاہے اختیار کرے اور جب چاہے اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب قبول کر لے۔ اس کے برعکس جہاں تک انسان کی اجتماعی زندگی کا تعلق ہے اس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوگا بلکہ اس کے اصول وضوابط اور قواعد وقوانین کسی ملک کے رہنے والے لوگ اپنی آزاد مرضی اور کثرتِ رائے سے جس طور سے چاہیں وضع کر سکیں گے۔ اور اس ضمن میں عقلی اور منطقی بحث تو کی جا سکے گی اور حالات و واقعات کے تقاضوں کا حوالہ بھی دیا جا سکے گا' مزید برآں اعداد و شماریات سے بھی شواہد پیش کئے جا سکیں گے' لیکن یہ دلیل مؤثر نہیں ہوگی کہ فلاں بات مذہب کی رو سے واجب یا حرام ہے!

اس عالمی اور گلوبل پس منظر میں جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان اچانک ایک ایسی قوم کی ''قومی جدوجہد'' کے نتیجے میں منصۂ شہود پر آ گیا جس کی قومیت کی واحد اساس دین و مذہب پر قائم تھی تو اسے ایک اعتبار سے تاریخی عمل میں ''اعجوبہ'' (Freak of History) بھی قرار دیا جا سکتا ہے' اور ایک پہلو سے عالمی رجحانات کے خلاف اعلانِ بغاوت سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

مسلمانانِ ہند کی قومی جدوجہد کے ''قائداعظم'' مسٹر محمد علی جناح تھے ـــــ جو نہ ''مولوی'' تھے نہ مذہبی سکالر یا دانشور بلکہ ایک ایسے خالص حقیقت پسند سیاست دان تھے جن کی تعلیم و تربیت کا پورا پس منظر خالص ''سیکولر'' تھا۔ ان کی سیاسی زندگی کا

معتد بہ حصہ آزادیٔ ہند کی جدوجہد کے ضمن میں ہندو مسلم مفاہمت کی کوششوں میں بسر ہوا تھا جن کے حوالے سے انہیں ''ہندو مسلم اتحاد کا سفیر'' کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ لیکن اس ضمن میں اپنی ربع صدی پر پھیلی ہوئی مساعی (۱۹۰۶ء تا ۱۹۳۱ء) کے نتائج سے مایوس اور بددل ہو کر وہ وطن کو خیرباد کہہ کر انگلستان میں رہائش پذیر اور گوشہ گیر ہو گئے تھے۔ ان کے اس وقت کے احساسات کا اندازہ ان کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے ۱۹۳۲ء میں شیخ محمد اکرام سے آکسفورڈ میں کہے تھے' یعنی: ''لیکن کیا کیا جائے؟ ہندو کوتاہ اندیش ہیں اور میرے خیال میں ناقابل اصلاح' اور مسلمانوں کی صفیں ایسے کم ہمت لوگوں سے بھری پڑی ہیں جو میرے ساتھ بات کرنے کے بعد ڈپٹی کمشنر سے مشورہ کریں گے کہ کیا کرنا چاہئے ـــــ ان دو گروہوں کے درمیان مجھ جیسے آدمی کی جگہ کہاں ہے؟'' (شیخ محمد اکرام: ''ماڈرن مسلم انڈیا'')

اُدھر اس عرصے کے دوران میں اسلامیانِ ہند کے افق پر ایک اور عظیم شخصیت کا سورج بھی طلوع ہو چکا تھا۔ یہ تھے علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال جو ایک جانب عربی اور فارسی میں مہارتِ تامّہ رکھنے کی بنا پر مسلم ثقافت و تہذیب کے اصول و فروع سے کماحقہٗ واقف تھے' تو دوسری جانب ایک عظیم فطری اور الہامی شاعر بھی تھے ـــــ اور ان سب پر مستزاد ایک مفکر اور فلسفی بھی تھے! ـــــ چنانچہ انہوں نے اپنی الہامی شاعری کے ذریعے اُمّتِ مسلمہ کے مستقبل کے بارے میں رجائی کیفیت پیدا کی اور ''کتابِ ملتِ بیضا'' کی از سرِنو ''شیرازہ بندی'' اور ''شاخِ ہاشمی'' کے دوبارہ ''برگ و بر پیدا'' کرنے کا مژدہ سنا کر اسلامیانِ ہند کے تعلیم یافتہ طبقے کے ایک بہت بڑے حصے میں احیاءِ اسلام کا جذبہ بیدار کر دیا۔ دوسری طرف خالص فلسفیانہ انداز میں ''الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید'' کا کٹھن مرحلہ طے کیا ـــــ تیسری جانب لادین جمہوریت اور وطنی قومیت ایسے مغربی تصورات کے بتوں پر ابراہیمیؑ تیشہ چلایا ـــــ اور چوتھی جانب مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا صور پھونکا ـــــ چنانچہ اوّلاً ۱۹۱۱ء میں علی گڑھ میں تقریر کر کے مسلم قومیت کی دینی و مذہبی اساس کو اجاگر کیا ـــــ اور بالآخر ۱۹۳۰ء کے خطبہ

الٰہ آباد میں مسلم قومیت کے زوردار فلسفیانہ اثبات کے ساتھ ساتھ ''ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک ''آزاد مسلم ریاست'' کے قیام کی کی پیشین گوئی بھی کی ـــــ اور اس کے اصل ہدف کی نشاندہی بھی کر دی ـــــ یعنی: ''اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں موقع مل جائے گا کہ اسلام کے چہرۂ انور پر جو بدنما داغ اور دھبے عرب ملوکیت کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں دور کر کے اصل اسلام کی حسین تصویر دنیا کے سامنے پیش کریں'' ـــــ جس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں دوبارہ خلافت راشدہ کا نظام قائم کریں!

پاکستان کے بانی، مؤسس اور معمار قائداعظم محمد علی جناح، اور اس کے مصور و مفکر و مبشر علامہ اقبال کی (اغلباً) پہلی ملاقات لندن میں ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس کے موقع پر ہوئی (جس میں قائداعظم تو وقتی سیاست سے علیحدگی کی بناء پر شریک نہیں تھے البتہ حضرت علامہ اقبال مندوب کی حیثیت سے شریک تھے!)

لندن کی اس ملاقات میں ان دونوں اعاظم رجال نے ع ''ولی را ولی می شناسد'' کے مصداق ایک دوسرے کو خوب پہچان لیا۔ اس کے بعد کے روابط اور خصوصاً خط و کتابت کے نتیجے میں اولاً قائداعظم ۱۹۳۴ء میں واپس ہندوستان تشریف لے آئے اور انہوں نے مایوسی اور بددلی سے کنارہ کشی کر کے از سرِ نو کمر ہمت کس لی اور مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک کی قیادت سنبھال لی ـــــ اور ثانیاً قائداعظم نے گویا علامہ اقبال کی ''مریدی'' اختیار کرتے ہوئے تحریک مسلم لیگ کے لئے ''احیاءِ اسلام'' کو نصب العین کے طور پر اختیار کر لیا۔

مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ مندرجہ بالا الفاظ سے بہت سی بھنویں تن جائیں گی اور بہت سی آنکھوں کے سامنے سوالیہ نشان کھڑے ہو جائیں گے ـــــ قائداعظم اور اقبال کے مرید!!؟ ـــــ اور قائداعظم کا نصب العین احیائے اسلام!!؟؟

ایسے حضرات کے لئے ـــــ پہلی بات کے ضمن میں قائداعظم کے حسب ذیل الفاظ کا حوالہ کافی ہونا چاہئے جو انہوں نے ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو کلکتہ میں حضرت علامہ کی وفات کی خبر ملنے پر کہے تھے (بحوالہ ''STAR OF INDIA'' مورخہ ۲۲/اپریل ۱۹۳۸ء)

"Mr. M.A. Jinnah said that the sorrowful news

of the death of Dr. Sir Muhammad Iqbal had plunged the world of Islam in gloom and mourning. Sir [Muhammad] Iqbal was undoubtedly one of the greatest poets, philiosophers and seers of humanity of all times. He took a prominent part in the politics of the country and in the intellectual and cultural reconstruction of the Islamic world. His contribution to the literature and thought of the world will live for ever.

To me he was a personal friend, philosopher and guide and as such the main source of my inspiration and spiritual support."

(ترجمہ) ''مسٹر محمد علی جناح نے فرمایا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے انتقال کی افسوسناک خبر نے عالمِ اسلام کو رنج و ماتم کی کیفیت سے دوچار کر دیا ہے۔ سر محمد اقبال بلاشبہ عالم انسانی کی پوری تاریخ کے عظیم ترین شاعروں، فلسفیوں اور پیش بینوں میں سے تھے۔ انہوں نے ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ پورے عالم اسلام کی فکری اور ثقافتی تعمیر نو کے عمل میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ عالمی سطح پر فکر و ادب کے میدان میں ان کی خدمات ہمیشہ زندہ رہیں گی ـــــ ذاتی طور پر میرے لئے وہ ایک دوست اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ رہنما بھی تھے۔ اور اس اعتبار سے انہوں نے میرے جذبات و احساسات کی آبیاری بھی کی اور مجھے روحانی سہارا بھی فراہم کیا''۔

ویسے اس ضمن میں ایک اور حوالہ بھی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں یونیورسٹی ہال لاہور میں منعقدہ ''اقبال ڈے کانفرنس'' کے دوسرے اجلاس منعقدہ ۲۵ مارچ میں قائداعظم نے فرمایا:

"If i live to see the ideal of a Muslim State being achieved in India, and I were then offered to make a choice between the works of Iqbal and the rulership of the Muslim State, I would prefer the former."

(شائع شدہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۴۰ء)

(ترجمہ) ''اگر میں ہندوستان میں ایک مسلم ریاست کے قیام کے نصب العین کے حصول تک زندہ رہا اور اُس وقت مجھے یہ اختیار دیا گیا کہ اس ریاست کی حکمرانی یا علامہ اقبال کی نگارشات میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلوں تو میرا انتخاب کلامِ اقبال ہوگا!''

یہاں یہ حقیقت نگاہوں سے اوجھل نہیں رہنی چاہئے کہ قائداعظم کا مزاج خطیبانہ لفاظی اور مبالغہ آرائی سے کوسوں دور تھا—اور وہ اپنا ایک ایک لفظ پوری طرح جانچ تول کر بولتے یا لکھتے تھے!

اور دوسری بات کے ضمن میں ان سینکڑوں تقاریر' خطبات' بیانات' خطوط اور انٹرویوز میں سے جو انہوں نے ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء دس سال کے عرصے میں اسی موضوع پر دیئے' صرف ایک حوالہ کفایت کرے گا' جو روزنامہ ''ڈان'' کی اشاعت بابت ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۵ء میں ''پیغام رمضان المبارک'' کے طور پر شائع ہوا:

".....The Musalmans are realizing more and more their responsibility in every direction. Every Musalman knows that the injunctions of the Quran are not confined to religious and moral duties. From tha Atlantic to the Ganges, says Gibbon, the Quran is acknowledeged as the fundamental code, not only the theology, but of civil and cirminal jurisprodence, and the laws which regulate the actions and the property of mankind are governed by the immutable sanctions of the will of God. Everyone, except those who are ignorant, knows that the Quran is the general code of the Muslims. A regligious, social, civil, commercial, military, judicial, criminal, penal code; it regulates everything from the ceremonies of religion to those of daily life; from the salvation of the soul to the health of the body; from the rights of all to those of each individual; from morality to crime, from

punishment here to that in the life to come, and our Prophet has enjoined on us that every Musalman should possess a copy of the Quran and be his own priest. Therefore Islam is not merely confined to the spiritual tenets and the doctrines or rituals and the ceremonies. It is a complete code regulating the whole Muslim society, every department of life, collective and individually.

(ترجمہ) ''اب مسلمانوں کو ہر سمت میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ ہر مسلمان خوب جانتا ہے کہ قرآن کے احکامات صرف مذہبی اور اخلاقی فرائض تک محدود نہیں ہیں' جیسے کہ گبن نے کہا تھا کہ: ''بحر اوقیانوس سے لے کر دریائے گنگا تک قرآن کو صرف الٰہیات ہی کے ضمن میں بنیادی ضابطہ نہیں مانا جاتا بلکہ دیوانی اور فوجداری قوانین' اور وہ تمام قواعد وضوابط بھی جو نوعِ انسانی کے اعمال وافعال اور ملکیت وتصرف میں نظم وضبط پیدا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی کبھی نہ تبدیل ہونے والی مشیت کے تابع ہیں''۔ صرف ناواقف لوگوں کو چھوڑ کر ہر انسان جانتا ہے کہ قرآن مسلمانوں کے لئے ایک ایسا عمومی ضابطہ ہے جس میں مذہبی' عمرانی' شہری' تجارتی' فوجی' عدالتی اور جرائم اور ان کی تعزیرات سمیت تمام پہلو شامل ہیں۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر عمل یعنی مذہبی رسومات سے لے کر روزمرہ زندگی کے معاملات ومسائل تک' روح کی فلاح ونجات سے لے کر جسم کی صحت اور تندرستی تک' اجتماعی مصالح اور حقوق سے لے کر انفرادی حقوق تک' اخلاقیات سے لے کر جرائم تک' اور دنیاوی سزا سے لے کر اخروی عذاب تک جملہ معاملات میں نظم وضبط پیدا کرتا ہے۔ اور ہمارے رسول (ﷺ) نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہر مسلمان قرآن کا ایک نسخہ اپنے پاس رکھے اور اپنا مفتی خود بنے۔ لہٰذا اسلام صرف روحانی معاملات اور عقائد ورسومات تک محدود نہیں ہے —— یہ ایک مکمل ضابطہ ہے جو پورے مسلم معاشرے کو زندگی کے جملہ پہلوؤں سمیت' جو خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی' منظم اور منضبط کرتا ہے''۔

لیکن جب ۱۹۴۷ء میں ماہ رمضان المبارک ہی کی ستائیسویں تاریخ کو پاکستان بالفعل عالم واقعہ میں آ گیا ـــــ تو اس موقع پر قائد اعظم کی حقیقت بینی اور واقعیت پسندی بروئے کار آئی!

ان کے سامنے یہ سنگین حقائق روزِ روشن کی طرح عیاں تھے کہ ـــــ ایک جانب پاکستان شدید مشکلات میں گھرا ہوا تھا اور ہندو کانگریس اور انگریز وائسرائے (اور اب گورنر جنرل ہند) کی ملی بھگت کے نتیجے میں یہ اپنے پہلے یوم ولادت ہی سے نزع کے عالم میں گرفتار تھا۔ اور بین الاقوامی سطح پر ذرا سی مخالفت اس عمارت کو زمیں بوس کرنے کے لئے کافی ہو جاتی۔ ادھر جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے پوری دنیا میں سیکولرزم کا ڈنکا بج رہا تھا اور اس پس منظر میں ایک ''اسلامی ریاست'' کے قیام کا طبل بجا دینا گویا پوری دنیا کو مخالفت کی دعوت دینے کے مترادف تھا ـــــ

دوسری جانب انہیں اطمینان تھا کہ اب جبکہ پاکستان کی صورت میں ایک ایسا ملک وجود میں آ گیا ہے جس کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلام کی پیرو ہے ـــــ اور ان میں ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا اِلٰہ اِلاّ اللہ!'' کے فلک شگاف نعروں نے احیاءِ اسلام کا صور بھی پھونک دیا ہے' خالص سیکولرزم کے اصولوں ـــــ یعنی اکثریت کی مرضی اور منشا کے مطابق ریاست و سیاست کی تشکیل اور دستور و قانون کی تدوین و تنفیذ ـــــ کے مطابق بھی خلافت راشدہ کا قیام ممکن ہے ـــــ تو اگر دشمن کو گڑ کھلا کر مارا جا سکے تو خواہ مخواہ زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قائد اعظم نے سلطنت خداداد پاکستان کا آغاز ایک سیکولر ریاست کی حیثیت سے کرنے میں مصلحت اور عافیت سمجھی! چنانچہ ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے افتتاح کے موقع پر آپ نے جو تقریر کی اس میں واقعتاً سیکولرزم کا رنگ موجود ہے' ـــــ خاص طور پر یہ فیصلہ کن اختتامی کلمات (CONCLUDING REMARKS) قابل غور ہیں۔ اور اگر کوئی سیکولرازم کا حامی ان سے اپنے لئے دلیل یا سند حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ہرگز سر تا سر غلط نہیں ہے! البتہ اس حقیقت کو نظر انداز کرنا کسی بھی اعتبار سے معقول نہیں

آیا۔ اب یہ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اسے خلافت راشدہ کا نمونہ بنائیں تا کہ خدا اپنے وعدہ پورے کرے اور مسلمانوں کو زمین کی بادشاہت دے۔ پاکستان میں سب کچھ ہے' اس کی پہاڑیوں' ریگستانوں اور میدانوں میں نباتات بھی ہیں اور معدنیات بھی۔ انہیں تسخیر کرنا پاکستانی قوم کا فرض ہے۔ قومیں نیک نیتی' دیانت داری' اچھے اعمال اور نظم وضبط سے بنتی ہیں اور اخلاقی برائیوں' منافقت' زر پرستی اور خود پسندی سے تباہ ہو جاتی ہیں''۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ ۱۱ ستمبر ۱۹۸۸ء)

قائداعظم کی شخصیت کی جو تصویر ان اقتباسات کے ذریعے سامنے آتی ہے اسے نہایت خوبصورتی کے ساتھ انگریزی کے صرف ایک جملے میں سمو دیا تھا مسٹر سورنسن (Mr.SORENSON) نے جو جنوری ۱۹۴۶ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے اس دس رکنی وفد کے رکن تھے جو سر رابرٹ رچرڈ کی سرکردگی میں ہندوستان کی سیاسی فضا کا جائزہ لینے کے لئے وارد ہند ہوا تھا۔ مسٹر سورنسن نے واپس جا کر "MY IMPRESSIONS OF INDIA" نامی کتاب لکھی جس میں قائداعظم سے اپنی ۱۰ جنوری ۱۹۴۶ء کی ملاقات کا لبِّ لباب ان الفاظ میں بیان کیا کہ:

"He (JINNAH) is a Sword of Islam resting in a secular scabbard!"

(ترجمہ) ''وہ (یعنی قائداعظم محمد علی جناح) اصلاً اسلام کی تلوار ہیں جو ایک سیکولر نیام میں رکھی ہوئی ہے۔''

الحمدللہ کہ قائداعظم کی توقعات بالکل صحیح ثابت ہوئیں اور تحریک پاکستان نے اسلام کے احیاء اور ایک اسلامی ریاست کے قیام کا جو صور پھونکا تھا ــــــ اور خصوصاً ۴۵ء تا ۴۷ء دو تین سالوں کے دوران اسلام زندہ' پاکستان زندہ باد اور'' پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہٰ الا اللہ'' کے فلک شگاف نعروں نے جو جوش وخروش پیدا کیا تھا. اس کا نتیجہ لگ بھگ ڈیڑھ سال ہی کی مدت میں اس صورت میں نکل آیا کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو'' قرارداد مقاصد'' پاس کر دی جس میں اعلان

کیا گیا کہ ہمارے نزدیک حاکمیت مطلقہ کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے جس کی ذات میں تکوینی اور تشریعی دونوں قسم کے اختیاراتِ مطلقہ جمع ہیں' اور پاکستان کے عوام یا ان کے نمائندوں کے پاس جو اختیارات ہیں وہ دراصل ایک مقدس امانت ہیں اور انہیں اصل حاکم مطلق کی عائد کردہ حدود و قیود کے اندر اندر ہی استعمال کیا جا سکتا ہے ـــــ اور اس طرح گویا پاکستان میں ایک اسلامی ریاست کی دستوری اساس کا بنیادی پتھر نصب کر دیا گیا۔

مزید برآں اس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ پاکستان میں جمہوریت' آزادی' مساوات اور عدلِ اجتماعی کے اصولوں کی وہ تعبیر اختیار کی جائے گی جو اسلام عطا فرماتا ہے ـــــ اور یہاں ریاست کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ مسلمانوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیاں ان اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بسر کرنے میں مدد دے جو قرآن مجید اور سنت رسول (ﷺ) نے عطا فرمائی ہیں ـــــ اگرچہ غیر مسلموں کو بھی یہ حق پوری طرح دیا جائے گا کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق اپنے مذہب پر عمل کریں اور اپنی ثقافت کو پروان چڑھائیں۔

قرارداد کے آخر میں قائداعظم کا حوالہ بھی دیا گیا کہ مؤسس پاکستان کے اعلان کے مطابق پاکستان کو ایسی جمہوری ریاست بنایا جائے گا جو اسلام کے اصولِ عدلِ اجتماعی پر مبنی ہو!

یہاں یہ حقیقت بھی لائق توجہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی دستور کا ''مطالبہ'' لے کر کھڑے ہونے والی پہلی شخصیت وہ تھی جو ماضی میں نہ مسلم لیگ کی حامی رہی تھی نہ پاکستان کی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی قیامِ پاکستان سے دس بارہ سال قبل تو مولانا ابوالکلام آزاد اور جمعیت علماء ہند کے متحدہ وطنی قومیت کے تصور پر شدید تنقید کرنے اور مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کے ضمن میں علامہ اقبال کے ان خیالات کو جو دقیق فلسفیانہ مباحث کی صورت میں سامنے آئے تھے عام فہم سلیس زبان میں ڈھال کر بہت وسیع حلقے میں پھیلانے کی بنا پر قومی تحریک کے کارکنوں کی آنکھ کا تارا رہے تھے' لیکن

۳۹۔۱۹۳۸ء میں انہوں نے مسلم قوم پرستی پر بھی شدید تنقید کی تھی اور ۱۹۴۰ء میں قراردادِ لاہور (گویا قراردادِ پاکستان) کی منظوری کے بعد انہوں نے اپنا راستہ قومی دھارے سے بالکل علیحدہ کر لیا تھا اور ''جماعت اسلامی'' کے نام سے ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کی تاسیس کر کے بزعم خویش پورے ہندوستان میں اسلامی حکومت یا ''حکومتِ الٰہیہ'' کے قیام کا بیڑا اٹھا لیا تھا ـــــ اور اس کے بعد وہ مسلسل تحریک مسلم لیگ اور تصورِ پاکستان پر تنقیدیں کرتے رہے تھے (جو بعض اوقات ''دلآزار'' بھی ہوتی تھیں!) ـــــ تاہم جب پاکستان بن گیا تو یہاں آ کر انہوں نے اس دلیل کی بنا پر کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے ''مطالبہ'' کیا کہ یہاں کا اساسی دستور اسلامی بنیادوں پر بنایا جانا چاہئے ـــــ تو پوری قوم نے ان کا ساتھ دیا' یہاں تک کہ خالص مسلم لیگی حلقوں نے بھی اس کی زبردست تائید کی۔ اور اس کے بعض فعال عناصر نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی سرکردگی میں یہ مطالبہ دستور ساز اسمبلی کے ایوان میں پرزور انداز میں پیش کیا ـــــ اس لئے کہ ابھی ۴۵ء تا ۴۷ء کے عرصے میں پیدا ہونے والا جوش وخروش پوری طرح برقرار تھا ـــــ اور خود دستور ساز اسمبلی کے ارکان وہی تھے جو اس تحریک کے نقطۂ عروج یعنی ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔

اس قرارداد کی مخالفت اسمبلی کے غیر مسلم اراکین کی جانب سے تو ہونی ہی تھی' بعض مسلمانوں کی طرف سے بھی ہوئی ـــــ اس لئے کہ مسلم لیگ چونکہ ایک قومی جماعت تھی لہٰذا اس کی صفوں میں عام سیدھے سادھے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ بعض چوٹی کے علماء کرام اور مشائخ عظام بھی تھے ـــــ تو بعض آزاد خیال یہاں تک کہ ملحد اور دہریئے بھی شامل تھے۔ چنانچہ اس قرارداد کی منظوری کے وقت ایسی آوازیں بھی سننے میں آئیں کہ ''آج ہمارے سر شرم سے جھک گئے ہیں' اور ہم ترقی یافتہ دنیا سے آنکھیں چار کرنے کے قابل نہیں رہے!'' تاہم وزیراعظم لیاقت علی خان نے اس قرارداد کی منظوری کو حصول آزادی کے بعد سب سے بڑا واقعہ قرار دیا ـــــ جبکہ

میرے نزدیک یہ عالمی سطح پر تاریخ انسانی کے عظیم ترین واقعات میں سے ایک تھا۔ اس لئے کہ اس کے ذریعے اس وقت جبکہ پوری دنیا میں سیکولرازم کا ڈنکا بج رہا تھا' دس کروڑ عوام کے نمائندوں نے اس سے بغاوت کرتے ہوئے ریاست و سیاست کو دین کے تابع کرنے کا اعلان کیا تھا!

تاہم جہاں ایک طرف تحریکِ پاکستان کے عوامی جذبات اور جوش وخروش کا دریا اسلام کی سمت بہنے کی کوشش کر رہا تھا' وہیں مسلمانوں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ جو لارڈ میکالے کے مرتب کردہ نظامِ تعلیم سے تربیت حاصل کر کے نکلا تھا' اور اب پاکستان میں یا سول حکومت اور فوج دونوں کے اعلیٰ مناصب پر فائز تھا' یا وکالت اور طبّ کے میدانوں میں اعلیٰ حیثیت کا حامل تھا' اور ان دونوں پر مستزاد انگریز کے پروردہ جاگیرداروں اور وڈیروں اور ان کی انگلستان سے تعلیم وتربیت حاصل کر کے آنے والی اولاد کا رہن سہن بھی خالص مغربی تھا اور ان کے ذہن وفکر پر بھی یورپی تصورات و نظریات کا غلبہ تھا' اور ریاست وسیاست کے باب میں سیکولرازم بھی ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ اور ان کے نزدیک پاکستان کا مطالبہ احیاءِ اسلام یا اسلامی ریاست کے قیام کے لئے نہیں تھا بلکہ صرف اس لئے تھا کہ ہندوستان کی مسلم اقلیت کو ہندوؤں کی غالب اکثریت کی جانب سے سیاسی وسماجی اور بالخصوص معاشی استحصال کا جو خطرہ تھا اس سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو جائے۔ لہٰذا قراردادِ مقاصد کے پاس ہوتے ہی اس طبقے کے دانشوروں کی جانب سے اسلامی ریاست کے تصور پر کاری ضرب کے طور پر یہ وار کیا گیا کہ مسلمان فرقوں اور مسلکوں میں منقسم ہیں جن کے عقائد میں بھی تھوڑا بہت اختلاف ہے اور قانون وشریعت کے میدان میں تو فقہوں کے مابین شدید بُعد اور فصل موجود ہے' تو پاکستان میں کس کا اسلام نافذ کیا جائے گا' ـــــ شیعہ کا یا سنی کا' اور دیوبندی کا یا بریلوی کا' اور مقلد کا یا غیر مقلد کا؟

اور میرے نزدیک یہ بھی اسی تحریک پاکستان کے دوران پیدا ہونے والے جذبے اور جوش وخروش کا مظہر تھا کہ چونکہ ایک اسلامی حکومت کے قیام کے امکان کی

جھلک نظر آ گئی تھی لہٰذا جملہ مسالک اور مذاہب فقہ سے تعلق رکھنے والے چوٹی کے ۳۱ علماء کرام نے کراچی میں جمع ہو کر قرارداد پاکستان کی منظوری کے ایک ہی سال بعد پاکستان کے دستور کے لئے بائیس متفق علیہ اصول مرتب کر کے سیکولر طبقات کے حملے کو ناکام کر دیا۔ اور اسلامی حکومت کے خلاف جو دلیل بڑی خود اعتمادی اور طنطنے کے ساتھ دی گئی تھی اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

یادش بخیر! ان ۳۱ علماء کرام اور مشائخ عظام کے اسماء گرامی یہاں اس لئے درج کئے جا رہے ہیں کہ اولاً تو یہ اندازہ ہو جائے کہ تمام فرقوں اور جملہ مکاتب فقہ کی چوٹی کی قیادت ان میں شامل تھی' اور ثانیاً اپنے ان ''محسن'' اسلاف کی یاد تو تازہ ہو جائے جنہوں نے ہماری اس قومی زندگی کے ایک اہم موڑ پر اسلام کی جانب سے سیکولر عناصر کے کاری وار کا دفاع کرنے میں اپنی ذمہ داری بطریق احسن ادا کی تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ آج ہم پاکستان میں جس قحط الرجال کا شکار ہیں اس کے پیش نظر حیرت ہوتی ہے کہ اب سے نصف صدی قبل کیسی کیسی عظیم شخصیات ہمارے مابین موجود تھیں جو ملک و ملت کے عظیم تر مفاد میں اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود کس طرح شیر و شکر ہو جاتی تھیں' فیغفر اللّٰہ لھم و رفع درجاتھم فی الفردوس! آمین یاربّ العالمین!!

۱) (علامہ) سید سلیمان ندوی (صدر مجلس ہذا)
۲) (مولانا) سید ابوالاعلیٰ مودودی (امیر جماعت اسلامی پاکستان)
۳) (مولانا) شمس الحق افغانی (وزیر معارف' ریاست قلات)
۴) (مولانا) بدر عالم (استاذ الحدیث' ٹنڈو الہ یار' سندھ)
۵) (مولانا) احتشام الحق تھانوی (مہتمم دار العلوم الاسلامیہ' اشرف آباد' سندھ)
۶) (مولانا) محمد عبدالحامد قادری' بدایونی (صدر جمعیت العلماء پاکستان)
۷) (مفتی) محمد شفیع (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام' مجلس دستور ساز پاکستان)
۸) (مولانا) محمد ادریس کاندھلوی (شیخ الجامعہ' جامعہ عباسیہ' بہاولپور)
۹) (مولانا) خیر محمد (مہتمم مدرسہ خیر المدارس' ملتان شہر)

۱۰) (مولانا مفتی) محمد حسن (مہتمم مدرسہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور)
۱۱) (پیر صاحب) محمد امین الحسنات (مانکی شریف سرحد)
۱۲) (مولانا) محمد یوسف بنوری (شیخ التفسیر اشرف آباد سندھ)
۱۳) (حاجی) خادم الاسلام محمد امین (المجاہد آباد پشاور صوبہ سرحد) خلیفہ حاجی ترنگ زئی
۱۴) (قاضی) عبدالصمد سربازی (قاضی قلات بلوچستان)
۱۵) (مولانا) اطہر علی (صدر جمعیت العلماء اسلام مشرقی پاکستان)
۱۶) (مولانا) ابوجعفر محمد صالح (امیر جمعیت حزب اللہ مشرقی پاکستان)
۱۷) (مولانا) راغب حسن (نائب صدر جمعیت العلماء اسلام مشرقی پاکستان)
۱۸) (مولانا) محمد حبیب الرحمٰن (سرسینہ شریف مشرقی پاکستان)
۱۹) (مولانا) محمد علی جالندھری (مجلس احرار اسلام پاکستان)
۲۰) (مولانا) داؤد غزنوی (صدر جمعیت اہلحدیث مغربی پاکستان)
۲۱) (مفتی) جعفر حسین مجتہد (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام)
۲۲) (مفتی حافظ) کفایت حسین مجتہد (ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان لاہور)
۲۳) (مولانا) محمد اسماعیل (ناظم جمعیت اہلحدیث پاکستان گوجرانوالہ)
۲۴) (مولانا) حبیب اللہ (جامعہ دینیہ دارالہدیٰ ٹھیڑھی خیرپور میرس)
۲۵) (مولانا) احمد علی (امیر انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ لاہور)
۲۶) (مولانا) محمد صادق (مہتمم مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی)
۲۷) (پروفیسر) عبدالخالق (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام)
۲۸) (مولانا) شمس الحق فرید پوری (صدر مہتمم مدرسہ اشرف العلوم ڈھاکہ)
۲۹) (مولانا) مفتی صاحب داد عفی عنہ (سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی)
۳۰) (مولانا) محمد ظفر احمد انصاری (سیکرٹری بورڈ آف تعلیمات اسلام مجلس دستور ساز پاکستان)
۳۱) (پیر صاحب) محمد ہاشم مجددی (ٹنڈو سائیں داد سندھ)

اول تو قرار دادِ مقاصد فی نفسہٖ اس عالمی نظام کے خلاف اعلانِ بغاوت کی

حیثیت رکھتی تھی جس میں دین و مذہب اور ریاست و سیاست کی جدائی اور علیحدگی بطور اصول موضوعہ طے ہو چکی تھی۔ چنانچہ یہ طے تھا کہ دین و مذہب کے دائرے میں، جس میں ہر فرد آزاد ہے، صرف تین چیزیں شامل ہوں گی، یعنی عقائد، عبادات اور پیدائش، فوتیدگی اور شادی کی رسومات ـــــ باقی جملہ اجتماعی معاملات، عائلی قوانین اور معاشرتی اقدار سے لے کر، دستور و قانون اور، معاشی و سیاسی نظام تک دین و مذہب کی بالادستی سے آزاد ہوں گے۔ سیکولرزم کے خلاف اس بغاوت میں رہی سہی کسر جملہ اسلامی فرقوں اور مسلکوں کی چوٹی کی قیادت نے اپنے متفق علیہ بائیس دستوری نکات کے ذریعے پوری کر دی جس نے سیکولرزم کی جانب سے واحد جوابی وار کو غیر موثر کر دیا۔

اس پر یقیناً عالم بالا میں ادنیٰ درجہ کے فرشتوں سے لے کر اعلیٰ رتبہ کے کرّوبیوں تک سب کی محفلوں میں مسرت کے شادیانے بجائے گئے ہوں گے کہ ع ''نعرہ زد عشق کہ خونی جگرے پیدا شد!'' اور دوسری طرف ابلیس لعین اور جنات میں سے اس کی صلبی و معنوی ذرّیت کے حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی ہو گی۔

اس جلتی پر تیل کا کام خان لیاقت علی خان کے دو اقدامات نے کیا۔ اور وہ اس طرح کہ جب بھارت کی کانگریس قیادت اور اس کے انگریز گورنر جنرل نے دیکھا کہ ان کی یہ اُمید پوری نہیں ہوئی کہ پاکستان پیدا ہوتے ہی ریت کے کچے گھروندے کے مانند ختم ہو جائے گا اور اس ضمن میں ان کی جملہ سازشیں ناکام ہو گئی ہیں ـــــ تو انہوں نے اس کے خاتمے کے لئے کسی فوجی جارحیت کے بارے میں سوچ بچار شروع کر دیا۔ اس پر خان لیاقت علی خان نے ایک جانب بھارت کی سرحد سے کل چودہ میل کے فاصلے پر یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں اپنا تاریخی مکالمہ کر بھارت کو خبردار کیا کہ ایسی کسی مہم جوئی سے باز رہے اور دوسری جانب پاکستان ڈے کی پریڈ میں عالم اسلام کے چودہ مسلمان ممالک کے فوجی دستوں کو شریک کر کے پوری دنیا کو پیغام دیا ـــــ جوان کے اپنے الفاظ میں یہ تھا کہ ''دنیا دیکھ لے! ہم اکیلے اور تنہا نہیں ہیں!'' ـــــ اس پر بھارت تو کسی مہم جوئی سے باز رہا، البتہ باطل کے مرئی اور غیر مرئی ایوانوں میں

پاکستان میں اسلام کی جانب پیش رفت کو روکنے کے لئے جوابی حملے کا فیصلہ ہوگیا۔

علامہ اقبال کو ـــــ قائد اعظم نے "SEER" یعنی غیب کے پردوں میں جھانکنے والا اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کو دیکھ لینے والا قرار دیا تھا۔ اوران کا خود بھی اپنے بارے میں دعویٰ تھا کہ ع ''گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دلِ وجود!'' چنانچہ انہوں نے اپنی حیاتِ دنیوی کے تقریباً بالکل آخری ایام میں غیر مرئی (INVISIBLE) عالم میں باطل کے سب سے بڑے اور اعلیٰ ترین ایوان کے ایک اجلاس کی کارروائی اپنی شہرۂ آفاق نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں پیش کی تھی۔ جس میں ابلیس لعین کے نائبین میں سے بعض نے تو یہ خیال پیش کیا تھا کہ عالمِ انسانیت میں ہمارے ابلیسی نظام کو مغرب کی جمہوریت سے خطرات لاحق ہیں اور بعض نے یہ کہا کہ مغربی جمہوریت تو نہیں البتہ اشتراکی نظام لازماً ہمارے نظام باطل کو تہہ و بالا کر کے رکھ دے گا! ـــــ جس پر ابلیس نے ان دونوں خیالات کو رد کر کے اپنے اختتامی خطاب میں کہا کہ مجھے ان دونوں سے ہرگز کوئی اندیشہ نہیں ہے، واحد خطرہ اُمّتِ مسلمہ سے ہے! ؎

ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اس اُمّت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے ابتک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو!

اور اگر چہ:

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں!
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مؤمن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

لیکن اس کے باوجود:

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!
الحذر! آئینِ پیغمبرؐ سے سوبار الحذر
حافظ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے گدائے رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں!

اور عالمِ انسانیت میں ابلیسی نظام کے بقا کی واحد صورت یہ ہے کہ:

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں!

لہٰذا اب جب ابلیسی قوتوں نے دیکھا کہ ایک دس کروڑ انسانوں کا ملک —— جو دنیا کے پسماندہ نہیں بلکہ نیم ترقی یافتہ ملکوں میں سے ہے اور جس میں ایک مثالی جدید اسلامی ریاست کے قیام کے امکانات بہت روشن ہیں —— ''آئینِ پیغمبرؐ'' کی جانب پیش قدمی کر رہا ہے تو ان کا جوابی اقدام شروع ہو گیا۔

شیطانی قوتوں کا یہ حملہ دو جہتی (TWO-PRONGED) تھا:

ایک یہ کہ انسانوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کی جو صلاحیت و قوت اللہ تعالیٰ نے شیطان کو عطا فرمائی ہے اسے بروئے کار لا کر مسلمانانِ پاکستان کی دینی و مذہبی قیادت کے دلوں میں یہ حسین خیال ڈال دیا گیا کہ تحریک پاکستان کے مذہبی جوش و خروش ہی کو مزید کیش کرا کے کیوں نہ ہم یہاں ایوانِ حکومت پر قبضہ جما لیں تاکہ پھر جملہ ریاستی ذرائع کو بروئے کار لا کر عوام کی ذہنی و فکری اور عملی و اخلاقی تربیت کا کام

بآسانی سرانجام دیا جا سکے! اور حکومت کے حصول کی راہ یسیر یعنی آسان راہ دنیا میں مروّج طریقے کے مطابق یہ ہے کہ انتخابات میں حصہ لیا جائے اور اسلامی نظام کے قیام کے نام پر لوگوں سے ووٹ طلب کئے جائیں ـــــ اور اگر عوام ایوان ہائے حکومت میں اکثریت دینی و مذہبی قیادت کو عطا کر دیں ـــــ تو پھر اسلامی نظام بھی قائم کر دیا جائے اور شریعت اسلامی بھی نافذ کر دی جائے!

علامہ اقبال نے تو پندرہ سولہ سال قبل (۳۶۔۱۹۳۵ء میں) اپنے تصور و تخیل کے مطابق اور اُس وقت کی مسلم مذہبی قیادت کی کیفیات کے پیش نظر یہ گمان کیا تھا کہ ابلیس لعین نے اپنے کارندوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ امت مسلمہ کو احیاءِ اسلام اور ''آئینِ پیغمبرؐ'' کی جانب پیش رفت سے روکنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کرو کہ ایک جانب:

؎ ''مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے!''

اور دوسری جانب اسے لاحاصل کلامی مباحث اور ''کتاب اللہ کی تاویلات'' میں الجھائے رکھو ـــــ مزید برآں احیاءِ اسلام کی جدوجہد کے اعتبار سے مغرب سے درآمد شدہ نظام انتخابات پر نہ صرف یہ کہ یہ پھبتی چست کی تھی کہ ع ''الیکشن' ممبری' کرسی صدارت۔ بنائے خوب آزادی نے پھندے'' اور ''اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں۔ نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے!'' بلکہ عین اسی زمانے میں جب حضرت علامہ علی گڑھ یونیورسٹی کے صدر شعبہ فلسفہ ڈاکٹر ظفر الحسن اور ان کے دو محبوب شاگردوں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور ڈاکٹر محمود احمد کی تجویز و تحریک پر احیاءِ اسلام کے مقصد کے لئے ''جمعیت شبان المسلمین'' کے نام سے ایک جماعت کے قیام کے بارے میں سوچ بچار کر رہے تھے جس میں صرف وہی لوگ شریک ہوتے جو دین پر کاربند اور مذہب کے پابند ہوں اور جس کی اساس بیعت اور امارت کے ٹھیٹھ اسلامی اصولوں پر ہونی تھی' اس میں یہ بھی طے کر دیا گیا تھا کہ یہ جماعت الیکشن میں کبھی حصہ نہیں لے گی!

لیکن افسوس در افسوس کہ ۵۱۔۱۹۵۰ء میں شیطان کا یہ ''الہام'' مؤثر اور کارگر ہو گیا کہ نظام اسلام کے قیام کے نعرے کے ساتھ ملکی انتخابات کے اکھاڑے میں

چھلانگ لگا دو جس نے اسلامی نظام کے قیام کو قوم کے متفقہ مطالبے کی بجائے انتخابی عمل میں ایک خالص سیاسی اور انتخابی نعرے کی حیثیت دے دی!—— اور قسمت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس ہمالیہ ایسی بڑی غلطی کا اوّل اوّل ارتکاب ایک ایسی شخصیت کی جانب سے ہوا جو نہ صرف یہ کہ دو سال قبل اسلامی دستور کا مطالبہ اور اس کے لئے عوامی تحریک ایسا صائب اور درست اقدام کر چکی تھی' بلکہ دس گیارہ سال قبل ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں اپنے خطبے ''اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے؟'' میں دلائل و براہین کے ساتھ ببانگِ دہل کہہ چکی تھی کہ مسلمانوں کی قومی تحریک کے نتیجے میں تو صرف ایک قومی ریاست ہی وجود میں آ سکتی ہے' اسلامی حکومت کے قیام کے لئے تو لازم ہے کہ پہلے ٹھیٹھ اسلامی دعوت کا آغاز کیا جائے اور تمام انسانوں کو بالعموم اور جو پہلے سے نسلاً مسلمان ہیں انہیں بالخصوص زوردار دعوت دی جائے کہ وہ اسلام کو شعوری طور پر اور عملاً اختیار کریں—— پھر ایسے لوگوں کو ایک منظم جماعت میں منسلک کیا جائے اور اس جماعت کی سعی و جہد کے ذریعے معاشرے میں ایسا ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی انقلاب برپا کر دیا جائے کہ اس میں کسی غیر اسلامی نظام کا چلنا ناممکن ہو جائے—— اس کے بغیر محض جذباتی نعروں کے ذریعے اسلامی حکومت کے قیام کا خیال ایک سراب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا!—— لیکن الفاظ قرآنی ﴿اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی ۝ ثُمَّ اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی ۝﴾ کے مصداق افسوس در افسوس اور پھر افسوس در افسوس کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۹۵۱ء میں پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں الیکشن میں امیدواری کو ''حرام'' اور پارٹی ٹکٹ کو ''لعنت'' قرار دیتے ہوئے ایک مثالی پنچائتی نظام کی وساطت سے حصہ لیا—— جس سے جماعت اسلامی کی حیثیت ایک ''اصولی اسلامی انقلابی جماعت'' کی بجائے یک دم ایک ''اسلام پسند قومی سیاسی جماعت'' کی ہوگئی! جس کا مقصود مطمحِ نظر' افراد کی ذاتی نیتوں اور ارادوں سے قطع نظر' کہ وہ تو ایک راز ہوتا ہے بندے اور ربّ کے مابین' ظاہری اعتبار سے حصولِ اقتدار ہی ہوتا ہے—— چنانچہ اسی کا مظہر تھا کہ جب خان

لیاقت علی خان سے ڈھاکہ کے جلسۂ عام میں مولانا مودودی کی نظر بندی کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ: ''مولانا مودودی پاکستان کے امیر المومنین بننا چاہتے ہیں' ہمارا کہنا یہ ہے کہ ابھی پاکستان کو ٹھیک طرح سے قائم تو ہو لینے دو' پھر جس کا جو جی چاہے بن لینا!'' ـــــ بہر حال اس طرح جب جماعت اسلامی کم از کم ظاہری اعتبار سے طالب اقتدار بن کر سامنے آ گئی تو ظاہر ہے کہ اب کسی دوسری سیاسی یا مذہبی جماعت کے اس کے ساتھ تعاون کرنے کا سوال خارج از بحث ہو گیا ـــــ چنانچہ ۵۱ء کے الیکشن میں جماعت اسلامی کو ایک سیٹ بھی نہیں مل سکی! اور یہ تو ایک معمولی سا اور چھوٹا نقصان تھا جو صرف ایک جماعت کو پہنچا' اصل اور بڑا نقصان یہ ہوا کہ جملہ مسلکوں اور حلقوں کی دینی و مذہبی قیادت کے جمع ہو کر دستورِ اسلامی کی تفصیلی تدوین اور شریعت اسلامی کے قوانین کی تنفید کا مطالبہ کرنے اور اس کے لئے اجتماعی مہم چلانے کے راستے مسدود ہو گئے ـــــ!

پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام کو روکنے کے لئے ابلیس کے دو جہتی حملے کا دوسرا وار خود انسانوں میں سے ابلیس کے ایجنٹوں اور گماشتوں کے ذریعے ہوا۔ واضح رہے کہ یوں تو ابلیس کے ایجنٹ انسانوں کی کسی بھی قوم اور نسل میں سے ہو سکتے ہیں' اور ہیں' لیکن نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد سے جو گروہ من حیث القوم اجتماعی طور پر ابلیس کا سب سے بڑا ایجنٹ بن چکا ہے وہ یہودی ہیں ـــــ! جن کے سب سے بڑے آلۂ کار ''واسپ'' (WASP) یعنی ''وہائٹ اینگلو سیکسن پراٹسٹنس'' ہیں۔ جن کا امام اوّل تو انگلستان تھا جس نے سب سے پہلے پوپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اپنا علیحدہ اور آزاد ''چرچ آف انگلینڈ'' قائم کر لیا تھا ـــــ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد اس ''واسپ'' کی سربراہی یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا کے ہاتھ میں آ چکی ہے!

چنانچہ برطانیہ نے اوّلاً پاکستان کی نوکر شاہی میں اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے ۱۶/اکتوبر ۱۹۵۱ء کو خان لیاقت علی خان کو شہید کرا دیا ـــــ جن کے بعد کوئی ایسی شخصیت میدان میں موجود نہ رہی جو مسلم لیگ کے شیرازے کو مجتمع رکھ سکتی ـــــ نتیجتاً دیکھتے ہی

دیکھتے مسلم لیگ کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ کچھ ہی عرصے میں تحلیل ہو کر رہ گئی ـــــ اور ثانیاً انڈین سول سروس سے تعلق رکھنے والے اپنے ایک دوسرے مہرے ملک غلام محمد کے ذریعے' جو اَب پاکستان کے گورنر جنرل تھے' پہلے ۱۶/اپریل ۱۹۵۳ء کو خان لیاقت علی خان کے جانشین خواجہ ناظم الدین کی وزارت برطرف کرائی ـــــ اور پھر ۲۴/اکتوبر ۱۹۵۴ء کو وہ دستور ساز اسمبلی بھی تحلیل کرا دی جو ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں کامیاب ہونے والوں پر مشتمل ہونے کے ناطے تحریک مسلم لیگ کی معنوی وراثت کی امین تھی!

اس کے بعد کچھ تحریک پاکستان کے بچے کھچے اثرات یا بالفاظ دیگر ''باقیات الصالحات'' نے زور لگایا ـــــ اور کچھ جماعت اسلامی نے اپنی جماعتی حیثیت میں دستورِ اسلامی کے مطالبے کی مہم چلائی ـــــ اور سب سے بڑھ کر اس لئے کہ مسلسل اکھیڑ پچھاڑ کے دوران حسنِ اتفاق سے پاکستان کی وزارتِ عظمٰی پر ایک ایسا شخص فائز ہو گیا جو اگرچہ برطانوی ہند کی بیوروکریسی ہی سے تعلق رکھتا تھا' لیکن نہ صرف ذہناً وقلباً مسلمان تھا' بلکہ عملاً بھی ''مسلم'' تھا ـــــ یعنی چوہدری محمد علی ـــــ تو ان کی مساعی اور دن رات کی انتھک محنت کے نتیجے میں اس نئی دستور ساز اسمبلی کے ذریعے' جو قیام پاکستان کے بعد منتخب ہونے والی صوبائی اسمبلیوں سے منتخب ہوئی تھی' ایک ایسا دستور منظور ہو گیا جس میں دین و مذہب کا عنصر معتد بہ حد تک موجود تھا۔ اور جسے رسمی طور پر تو ۲۳/مارچ ۱۹۵۶ء کو نافذ کر کے پاکستان کو ''اسلامی جمہوریہ'' قرار دے دیا گیا تھا۔ تاہم اس کا عملی نفاذ نئے عام انتخابات ہی کے بعد ممکن تھا!

اس پر ابلیسی قوتیں ایک بار پھر حرکت میں آ گئیں اور برطانوی سول سروس کے ایک اور مہرے سکندر مرزا نے جو نسلاً بھی مسلم بنگال کے مشہور غدّار میر جعفر کی اولاد سے تھا' اوّلاً تو دو سال تک انتخابات کو مسلسل مؤخر کئے رکھا اور جب حتمی طور پر طے ہو گیا کہ عام انتخابات اوائل ۵۹ء میں لازماً منعقد ہوں گے تو اس سے قبل ہی ۷/اور ۱۸/اکتوبر ۱۹۵۸ء کی درمیانی شب کو ملک بھر میں اپنی سربراہی میں مارشل لاء نافذ کر دیا ـــــ اور دستور اور دستوریہ دونوں کی بساط ایک مرتبہ پھر لپیٹ کر رکھ دی۔ اگرچہ

سکندر مرزا کو اس نئے نظام کی سربراہی دس دن بھی نصیب نہ ہوئی اور ۲۷/اکتوبر کو ''حق بحقدار رسید'' کے مطابق مارشل لاء کی سربراہی افواج پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان نے خود سنبھال لی۔

جنرل ایوب خاں کے مارشل لاء سے لے کر آج تک سوائے بھٹو صاحب کی حکومت کے لگ بھگ پانچ سالوں کے باقی پورے عرصے کے دوران پاکستان میں فوج ہی کی حکومت قائم رہی ہے۔ اگرچہ اس کے رنگ (SHADES) ذرا مختلف رہے ہیں' یعنی کبھی عریاں مارشل لاء' کبھی صدارتی نظام حکومت کے ساتھ کسی جرنیل کی صدارت'—— اور کبھی بظاہر سویلین سیاسی حکومت جس میں اصل حساس معاملات فوج ہی کے کنٹرول میں رہتے تھے—— اور دیکھنے میں تو اختیارات صدر مملکت اور وزیر اعظم کے ہاتھوں میں ہوتے تھے لیکن اصلاً ایک تکون کی شکل ہوتی تھی جس کا تیسرا بازو افواج پاکستان کا کمانڈر انچیف ہوتا تھا۔

پاکستان کو جو سول اور ملٹری بیوروکریسی انگریز سے وراثت میں ملی تھی' اس میں سے اگرچہ سول افسر بھی اکثر و بیشتر ذہناً اور مزاجاً مغربی رنگ ہی میں رنگے ہوئے تھے' لیکن فوجی افسروں میں یہ رنگ زیادہ گہرا تھا۔ ان کی شکل وصورت' وضع قطع' رہن سہن' اور اکل وشرب کے ذوق اور آداب سب خالصتاً یورپی تھے—— چنانچہ فوج کی حکومت کے دوران اسلام کی جانب کسی عملی پیش رفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا فوج کی سربراہی میں پاکستان میں سیاسی اور معاشی نظام بھی خالص اسی سیکولر صورت میں چلتا رہا جس میں انگریز نے چھوڑا تھا—— اور معاشرتی سطح پر بھی بے پردگی' عریانی اور مخلوط معاشرت کی جانب مسلسل ترقی ہوتی چلی گئی۔ اس میں تھوڑا سا استثناء جنرل ضیاء الحق صاحب کا ہے' لیکن ان کے بارے میں بھی یہ تجزیہ کرنا مشکل ہے کہ انہوں نے نیم ولی کے ساتھ جو چند الٹے سیدھے ''اسلامی اقدامات'' کئے ان کا اصل سبب خود ان کا مذہبی مزاج اور صوم وصلوٰۃ کا پابند ہونا تھا یا یہ حکمت عملی تھی کہ چونکہ انہوں نے تحریک نظام مصطفیٰؐ کو ہائی جیک کیا تھا لہٰذا اس کے دوران جو جذبہ اور جوش وخروش پیدا ہوا تھا

اس کی اسٹیم کو تدریجاً خارج اور ختم کرنے کے لئے عوام کو اس قسم کے دم دلاسے دینے ضروری تھے!

پاکستان میں پہلا مارشل لاء نافذ کرنے والے گورنر جنرل سکندر مرزا کا تو یہ قول بھی اُن دنوں سننے میں آیا تھا کہ پاکستان کے تمام مولویوں کو ایک سمندری جہاز میں سوار کر دینا چاہئے اور پھر اس جہاز کو گہرے سمندر میں لے جا کر غرق کر دینا چاہئے! لیکن جس شخص نے عملاً گیارہ برس تک یہاں کوسِ لمن الملک بجایا اس کے بھی ارادے اس سے عیاں ہیں کہ اسے پاکستان کے نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' میں ''اسلامی'' کا لفظ پسند نہیں تھا اور وہ اسے حذف کر دینے پر تلا ہوا تھا۔ ادھر میدان میں کوئی طاقت رکاوٹ بننے اور چیلنج کرنے والی موجود نہیں تھی۔ اس لئے کہ وہ مسلم لیگ تو بحیثیت جماعت بہت پہلے تحلیل ہو چکی تھی جس نے پاکستان قائم کیا تھا' اب تحریک پاکستان کا جذبہ اور جوش و خروش بھی سرد پڑ چکا تھا۔ رہیں مذہبی جماعتیں تو اول تو وہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت پر لاہور کے مارشل لاء کے وحشیانہ کریک ڈاؤن کے نتیجے میں دہشت زدہ تھیں اور پھر جسٹس محمد منیر کی سربراہی میں بننے والے تحقیقاتی کمیشن نے علماء کی بھرپور کردار کشی کی تھی۔ اس طرح دین و مذہب کی طرف سے مدافعت کرنے والی کوئی قوت میدان میں موجود نہ تھی —— وہ تو غالباً خود صدر ایوب صاحب کے مشیروں نے انہیں سمجھایا کہ پاکستان کے تاریخی اور تشکیلی پس منظر کے اعتبار سے یہاں کے عوام کو کچھ نہ کچھ مذہبی ''لالی پاپ'' دیئے رکھنے ضروری ہیں —— چنانچہ نام بھی برقرار رہ گیا' قرارداد مقاصد بھی قائم رہی' اور اسلامی نظریاتی کونسل بھی برقرار رہ گئی۔ اگرچہ اس کے بالمقابل ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی سربراہی میں —— جو کینیڈا کی مک گل یونیورسٹی کے یہودی اساتذہ سے تربیت لے کر آئے تھے اور اپنے تجدد پسندانہ تصورات و خیالات کی بنا پر صدر ایوب خان صاحب کے بہت منظورِ نظر تھے —— ''ادارہ تحقیقات اسلامی'' بھی قائم کر دیا گیا تاکہ اس کے ذریعے اسلام کو ''ماڈرن'' بنانے کا کام بھی شروع ہو جائے!

پاکستان کے دستور کے اس نمائشی اور آرائشی اسلام میں کچھ مزید اضافہ ۱۹۷۳ء میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے ذریعے ہوا۔ وہ اگرچہ خود بھی ایک خالص سیکولر مزاج کے انسان تھے اور مزید برآں وہ ایک ایسی عوامی تحریک کے بل پر ایوان اقتدار میں پہنچے تھے جس میں مذہب کو تین میں سے صرف ایک کی حیثیت حاصل تھی ـــــ یعنی ''ہماری سیاست جمہوریت ہے، ہماری معیشت سوشلزم ہے اور ہمارا مذہب اسلام ہے'' ـــــ لیکن چونکہ ان کی خواہش تھی کہ وہ پاکستان کے لئے ایسا دستور بنائیں جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہو لہٰذا انہوں نے ان آرائشی اور نمائشی دفعات میں مزید اضافہ کر دیا کہ ''پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہے'' اور ''صدر کے ساتھ ساتھ وزیراعظم کا بھی مسلمان ہونا لازمی ہے'' اور ''پاکستان کے تمام موجودہ قوانین شریعت کے مطابق بنائے جائیں گے اور آئندہ کوئی قانون سازی کتاب وسنت کے منافی نہیں کی جا سکے گی'' (دفعہ ۲۲۷ دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان) ـــــ لیکن ''احتیاط'' یہ کی کہ اس دفعہ کو اسلامی نظریاتی کونسل کے ساتھ نتھی کر دیا کہ اس پر عمل درآمد ''صرف'' اس طور سے ہوگا کہ کونسل سفارشات پیش کرتی رہے گی، اور بس! ـــــ اس سے آگے ان سفارشات کا حشر کیا ہوگا اس کا کوئی تذکرہ تک نہیں کیا گیا ـــــ البتہ چونکہ مسٹر بھٹو خود ایک عوامی سیاسی تحریک کے ذریعے اقتدار میں آئے تھے، لہٰذا انہوں نے اس عظیم عوامی تحریک کو جو ایک خالص مذہبی معاملے میں چلی تھی صحیح طور سے ہینڈل کیا ـــــ اور ۷۴ء کی ختم نبوت کی تحریک کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے ایک نہایت معقول اور منطقی طریق کار کے ذریعے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔ چنانچہ دستور پاکستان کی یہ واحد اسلامی شق ہے جس کا کسی قدر اثر عملی دنیا میں بھی مرتب ہوتا ہے ـــــ یہی وجہ ہے کہ یہ شق پوری سیکولر دنیا کو کسی طرح بھی ہضم نہیں ہوتی۔

صدر جنرل ضیاء الحق نے چونکہ نظام مصطفیٰ (ﷺ) کی جذبات سے بھری (CHARGED & LOADED) فضا میں اقتدار پر قبضہ کیا تھا لہٰذا انہوں نے ۷۳ء کے دستور کے نہلے پر یہ دہلا مارا کہ قرارداد مقاصد کو ''دیباچے'' سے اٹھا کر دفعہ

۲۔الف کے طور پر باقاعدہ داخلِ دستور کر دیا۔مزید برآں ایک فیڈرل شریعت کورٹ بھی قائم کر دی جو اس اعتبار سے تو بظاہر بہت ذی اختیار تھی کہ جس قانون یا اس کی کسی دفعہ کو یہ عدالت ''غیر اسلامی'' قرار دے دے گی اس کے ضمن میں مرکزی یا صوبائی حکومت کو مطلع کر دے گی کہ فلاں مدت کے بعد یہ قانون یا دفعہ ساقط اور کالعدم ہو جائے گی لہٰذا اس کے اندر اندر متبادل قانون سازی کر لی جائے۔اگرچہ اس کے خلاف اپیل سپریم کورٹ کے شریعت بنچ میں کی جا سکے گی لیکن اگر وہاں سے بھی توثیق ہو گئی تو پھر وہ فیصلہ قطعی طور پر نافذ العمل ہو گا۔لیکن جنرل ضیاء الحق نے بھی یہ احتیاط ملحوظ رکھی کہ چار امور کو اس عدالت کے دائرہ کار اور حیطہ اختیار سے مستثنیٰ قرار دیا ـــــ یعنی (i) دستور پاکستان (ii) مالی معاملات (دس سال تک کی مدت کے لئے!) (iii) عدالتوں اور ٹریبونلز کے قواعد وضوابط اور (iv) مسلم عائلی قوانین!

الغرض پاکستان کے دستور اساسی کی ان چند غیر مؤثر دفعات پر مشتمل ہے سلطنتِ خداداد پاکستان کی کل ''اسلامیت'' ـــــ اس سے بڑھ کر پاکستان میں ''مذہب اسلام'' کے مظاہر وشعائر جیسے مساجد اور جمعہ و جماعات کا نظام' احترام رمضان مبارک' حج بیت اللہ کے لئے بڑی تعداد میں حاجیوں کا جانا' ـــــ مزید برآں مرکزی اور صوبائی ملازمتوں کی سطح پر سیرت النبی ﷺ کے جلسے وغیرہ تو پوری آن بان اور شان کے ساتھ موجود ہیں' باقی اجتماعی زندگی کا پورا دھارا خالص سیکولرزم کے رخ پر بہتا رہا ہے!

۱۹۹۷ء میں جب پاکستان کے عام انتخابات میں ''مسلم لیگ'' کا نام رکھنے والی ایک جماعت کو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی اور ایک ''شریف'' گھرانا پاکستان میں برسر اقتدار آ گیا جو صوم وصلوٰۃ کا نمایاں طور پر پابند تھا تو حرم مکّی کی ایک اتفاقی ملاقات کے حوالے سے میں نے میاں محمد شریف صاحب سے رابطہ کیا ـــــ جو اپنے تینوں بیٹوں (نواز شریف' شہباز شریف اور عباس شریف) سمیت قرآن اکیڈمی تشریف لے آئے۔تب میں نے عرض کیا کہ دستور پاکستان میں بحمد اللہ پورا اسلام موجود ہے لیکن چند چور دروازوں کی بنا پر بالکل غیر مؤثر ہے جس سے یہ ایک منافقت کا

پلندہ بن گیا ہے۔ اب مسلم لیگ کو اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل ہوگئی ہے لہٰذا ہمت کر کے یہ چور دروازے بند کر دیں تا کہ علامہ اقبال کے تصور کے مطابق پارلیمنٹ ہی کے ذریعے اجتہاد اور اسلامی قانون کی تدوینِ نو اور پھر اس کی ترویج و تنفیذ کا عمل جاری ہو جائے۔ لیکن افسوس کہ انہوں نے دو مزید ملاقاتوں میں میری مجوزہ ترامیم کو قبول کرنے کے مؤکد وعدے تو کیے لیکن عملاً وہ پندرھویں ترمیم کے نام سے ایسا مسودہ لے آئے جو انہیں پارلیمنٹ ہی نہیں عدلیہ سے بھی کلیتاً آزاد کر کے از منہ وسطیٰ کے سلطان یا خلیفۃ المسلمین ہی نہیں امیر المومنین کا درجہ دے دیتی —— جو ظاہر ہے تیرھویں اور چودھویں ترامیم کے ذریعے حاصل شدہ اختیارات کی بنا پر اسمبلی سے تو منظور کرایا جا سکتا تھا' سینٹ سے منظور ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا! —— اس طرح پاکستان کے دستور کی یہ اسلامی دفعات جوں کی توں رہ گئیں!

اور اب ایک ایسا جنرل سریر آرائے اقتدار ہوا ہے جو کھلم کھلا سیکولرزم کا حامی ہی نہیں داعی اور پرچارک بھی ہے' جس نے اقتدار میں آتے ہی مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنا آئیڈیل قرار دیا تھا (اگرچہ بعد میں صدر ایوب خان ہی کی طرح غالباً اپنے مشیروں کے کہنے پر تھوڑی سی ترمیم کر کے اپنا آئیڈیل قائد اعظم کو قرار دے دیا ہے!) مزید برآں' پوری دنیا کو اپنے ''لادینی'' ہی نہیں ''غیر مذہبی آدمی'' ہونے کا یقین دلانے کے لئے اپنے آفیشل فوٹو سیشن میں اپنی گود میں دو کتے لے کر تصویر کھنچوائی۔ اور کئی مواقع پر برملا کہا کہ میں نماز نہیں پڑھتا۔ باقی ہمارے معاشرے میں عام طور پر مشہور ''چار شرعی عیبوں'' میں سے کون کون سے ان کی ذاتِ والا صفات میں موجود ہیں یہ اللہ ہی کو معلوم ہے —— انہوں نے حال ہی میں پاکستانی معاشرے کا جو تجزیہ کیا ہے' جو شاید بہت زیادہ غلط بھی نہیں ہے' وہ یہ ہے کہ پاکستان میں پانچ فیصد ''مذہبی انتہا پسند'' ہیں اور تقریباً اتنے ہی اس کے بالکل برعکس دین و مذہب سے بیزار اور مغربیت کے پرستار ہیں —— باقی سب ''لبرل مسلمان'' ہیں —— اور لبرل مسلمان کی ان کے نزدیک تعریف یہ ہے کہ وہ موروثی عقائد اور ناموں کے اعتبار سے تو مسلمان ہیں' باقی اسلام

پر عمل کو ضروری خیال نہیں کرتے ـــــ یا کسی قدر عمل کرتے بھی ہیں تو صرف صوم وصلوٰۃ پر ـــــ اور وہ بھی التزاماً نہیں بلکہ ''گاہے گاہے''!

صدر جنرل پرویز مشرف ذہین بھی ہیں اور باصلاحیت بھی' مہم جو بھی ہیں لیکن ساتھ ہی مصلحت بین بھی' گفتگو اور تقریر میں بھی مہارت رکھتے ہیں' اور انٹرویوز اور پریس کانفرنسوں میں بھی اپنی خود اعتمادی اور حاضر جوابی کا لوہا منوا چکے ہیں' ـــــ اور سب سے بڑھ کر ایک کامیاب ''سیاست دان'' کا یہ وصف بھی ان میں بتمام وکمال موجود ہے کہ حالات کا تقاضا دیکھ کر اپنے موقف میں پورا یوٹرن لینے میں بھی نہ اپنی انا کو راہ میں آنے دیتے ہیں نہ عزت نفس کے تقاضے کو! ـــــ پھر اس وقت پوری مغربی دنیا اور خاص طور پر ''سول سپریم پاور آن ارتھ'' یعنی امریکہ بہادر ان کی پشت پر ہے' اور ظاہر ہے کہ پاکستان میں تو امریکہ کی پشت پناہی کا حامل شخص ''جسے پی چاہیں وہی سہاگن'' کا مصداقِ کامل ہوتا ہے' ـــــ ان داخلی اور خارجی کیفیات کے ساتھ وہ پاکستانی معاشرے کے ''مذہبی انتہا پسندی'' کے استیصال کے عزائم کے اظہار کے ساتھ ساتھ بزبان حال مسلسل مذہبی اور دینی قوتوں کو للکار رہے ہیں۔ ادھر اس وقت دینی اور مذہبی جماعتوں کی حالت بھی طالبانِ افغانستان کی افسوسناک ہزیمت کے باعث پیدا ہونے والی پژمردگی اور دل شکستگی کی بنا پر تقریباً ایسی ہی ہے جیسی جنرل ایوب خان کے عنانِ حکومت سنبھالنے کے وقت تھی' توقع ''یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین!'' کے سوال کے ضمن میں سوچ بچار ضروری ہے۔ لیکن اس کے بارے میں غور وفکر سے پہلے ضروری ہے کہ پاکستان میں پہلے مارشل لاء کے نفاذ سے لے کر آج تک پاکستان کی دینی اور مذہبی قوتوں کا کیا کردار رہا ـــــ اور بالخصوص نیم دینی اور نیم سیاسی جماعتوں کا کیا رول رہا ـــــ اس پر ایک نظر ڈال لینی چاہئے!

(جاری ہے)

واقعۂ کربلا

حقائق وواقعات کی روشنی میں

ازقلم: مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آغاز ہی سے مسلمانوں میں خانہ جنگی کی جو المناک صورت حال برپا ہوئی تھی، آنحضرت ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق، اس کا خاتمہ حضرت علیؓ کے جانشین سیّدنا حسن بن علی (رضی اللہ عنہما) کے ہاتھوں سے ہوا، اور وہ اس طرح کہ آپؓ نے خلافت کا ادارہ تمام تر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لئے چھوڑ کر خود کو اُس نزاع سے دستبردار کرلیا۔ یہ ۴۱ھ کی بات ہے جسے اسلامی تاریخ میں ''عام الجماعۃ'' (اجتماعیت واپس آنے کا سال) کہا گیا ہے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے بڑے بھائی کے اس فیصلے سے متفق نہ تھے، مگر جب حضرت حسنؓ کی طرف سے فیصلے پر عملدرآمد ہوگیا تب سے وہ بھی اس کے احترام کو لازم جانتے رہے اور رفتہ رفتہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ تعلقات میں خوشگواری کی کیفیت بھی پیدا ہوگئی۔

مصالحت اور خوشگواری کی یہ فضا پندرہ سال تک چلتی رہی جبکہ اس دوران میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نویں سال میں انتقال فرماگئے۔ مگر سولہویں سال (۵۶ھ) میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب اپنے بڑھاپے کے احساس سے اپنے بعد کے لئے کسی کو جانشین اور ولی عہد نامزد کرنے کے لئے سوچا، اور پھر اپنے بیٹے یزید کو اس کے لئے موزوں قرار دیا تو نئے سرے سے ایک اختلاف کی صورت پیدا ہونا شروع ہوئی۔ اختلاف کرنے والوں میں صرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ ہی نہیں تھے بلکہ حضرت ابوبکر

صدیقؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن بن ابی بکر (رضی اللہ عنہما)' حضرت عمر فاروقؓ کے بیٹے عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما)' حضرت زبیرؓ بن عوام کے بیٹے عبد اللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہما) بھی اس میں شامل تھے۔

اس اختلاف کی سب سے اہم اصولی بنیاد یہ تھی کہ باپ اپنے بعد کے لئے بیٹے کو بطور ولی عہد خلافت نامزد کرے' یہ اسلامی خلافت کا نہیں قیصر و کسریٰ کی سلطنت کا دستور ہے۔ دوسری ایک بنیاد بظاہر یہ تھی کہ اصحاب نبی ﷺ کی موجودگی میں انہی میں سے کوئی منصب خلافت کے لئے موزوں ہوسکتا ہے نہ کہ بعد میں پیدا ہونے والا ایک نوعمر۔ ان دو کے علاوہ ایک تیسری بات جو اس سلسلے میں بے حد مشہور ہے کہ اس اختلاف کی ایک اہم بنیاد یہ بھی تھی کہ یزید بڑا فاسق و فاجر ہے' یہ بات کہیں اس اختلاف کی روداد میں آخر تک نہیں پائی جاتی' محض ''زیب داستاں'' کے طور پر بڑھائی گئی بات ہے' حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا نقطہ نظر ان حضرات کے بالمقابل بظاہر یہ تھا کہ خلافت کے سلسلے میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز مضبوط انتظامی اہلیت اور گرفت ہے۔ اور اس معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ یزید ہی کی خلافت کی شکل میں امید کرتے تھے کہ ادارۂ خلافت مضبوط رہے گا اور وہ افراتفری نہیں پھیلے گی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد پیدا ہوگئی تھی۔ مؤرخین نے اگرچہ یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فیصلے میں محبتِ پدری کا بھی دخل تھا' مگر خود انہوں نے اس طرح کے کسی محرک سے اپنی براءت کا اظہار کیا ہے۔

یہی اختلاف تھا جس سے واقعۂ کربلا کی داغ بیل پڑی اور یہ خاص کر اہل کوفہ تھے جنہوں نے اس اختلاف کا سلسلہ کربلا کے میدان سے ملا دینے میں پورا کردار ادا کیا۔ کوفہ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دار الخلافہ رہا تھا اس لئے قدرتی طور پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے قریبی تعلق رکھنے والے لوگ وہاں پائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں کے لوگوں کی ایک مستقل خصوصیت شوریدہ سری اور تلون مزاجی اور حکمرانوں سے

چپقلش بھی تھی۔ اس کی بنا پر ان مذکورہ بالا پندرہ سالوں میں بھی لازماً وہاں ایک بڑا حلقہ ایسے لوگوں کا ہو جانا چاہئے تھا جو حضرت امیر معاویہؓ کے خلاف کوئی بڑا محاذ قائم ہو جانے کا خواہش مند ہو۔ مزید برآں عبداللہ بن سبا (یہودی منافق) کی ریشہ دوانیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دور ہی سے وہاں ایک ایسا کالم پیدا کر دیا تھا جسے مرکز خلافت سے محاذ آرائی ہی میں ''اسلام کی خدمت'' نظر آتی تھی۔ ان متعدد عوامل کے تحت کچھ لوگوں نے اوّلاً تو حضرت حسنؓ کی وفات کے فوراً بعد ہی چاہا تھا کہ حضرت حسینؓ کو از سر نو امیر معاویہؓ کے خلاف متحرک کر دیں جس میں وہ ناکام رہے۔ اس کے بعد ولی عہدی کے مسئلہ میں اختلاف پر ان لوگوں کی توقعات پھر زندہ ہوئیں اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے رابطہ پیدا کر کے چاہا کہ اس مسئلہ پر آپ کو حضرت معاویہؓ کے خلاف میدان میں اتار دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسلامی جمعیت کی حفاظت فرمائی اور ان کا یہ حربہ بھی کارگر نہیں ہو سکا۔ البتہ اس ضمن میں یہ بات ضرور سامنے آ گئی کہ اس ولی عہدی کے مسئلہ نے حضرت حسینؓ کی سوچ کو بھی بہرحال اس راہ پر لگا دیا ہے اور حضرت معاویہؓ کے بعد ٹکراؤ کی صورت پیش آ جانے کے کافی امکانات ہیں۔

ولی عہدی کے مسئلہ پر جو ایک روایت صحابیٔ رسول حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو ملزم ٹھہراتی ہوئی ملتی ہے' کہ یزید کی ولی عہدی کی تجویز دراصل ان کے دماغ سے نکلی تھی اور صرف اپنا عہدہ (کوفہ کی گورنری) بچانے کے لئے انہوں نے' یہ جانتے بوجھتے کہ اس کا انجام اسلامی جمعیت کے لئے تباہ کن ہو سکتا ہے' یہ تجویز دی تھی' اس روایت کی جانچ کی جاتی ہے تو یہ ایک انتہائی مہمل افسانے سے زیادہ کچھ نہیں نکلتی۔ جبکہ حضرت مغیرہؓ (یکے از اصحابِ بیعتِ رضوان رضی اللہ عنہم) خود قرآن پاک کی رو سے ایسے درجے کے فضائل والے صحابی ہیں کہ کوئی مضبوط روایت بھی ہو تو ان آیتوں کے مقابلے میں اس روایت کو دیوار سے مار دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوگا۔

حضرت معاویہؓ نے یزید کی ولی عہدی کے بارے میں مملکت کے ایک بڑے حلقے کا رسمی (Formal) اعتماد حاصل کر کے اپنے فیصلے کو قطعیت کا درجہ دے دیا مگر اس

اعتماد کے ووٹ میں مکّے اور مدینے کی کمی رہی۔ تب آپ نے وہاں کا ایک سفر کیا تا کہ اس کمی کو (خاص کر مدینہ منورہ کے اعتماد کی کمی کو) دُور کیا جا سکے جس کی نمائندگی عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن زبیر اور حسین بن علی (رضی اللہ عنہم) کی طرف سے مخالفت کی شکل میں ہو رہی تھی۔

اس سفر کا اور وہاں ان چاروں حضرات سے ملاقات وغیرہ کا جو قصہ تاریخی روایتوں میں مذکور ہے' اس کا بڑا حصہ نہایت مضحکہ خیز اور چاروں بزرگوں کے نام کو قطعی بٹہ لگانے والا ہے۔ البتہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ ایک طرف تو یہ چاروں حضرات ـــــ بشرطیکہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ بھی اس وقت زندہ رہے ہوں' ورنہ باقی تینوں حضرات ـــــ اپنے موقف پر قائم رہے' اور دوسری طرف حضرت معاویہؓ بھی اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ یہ اختلاف ختم نہیں ہو سکے گا اور یزید کو اقتدار میں آنے پر اس مخالفت کا سامنا کرنا ہی ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی موت کا وقت آنے پر ان حضرات کے سلسلے میں یزید کو مناسب وصیتیں بھی فرمائیں' جن میں حضرت حسینؓ کے لئے ہر ممکن طور سے حسنِ معاملہ کی تاکید تھی۔

ولی عہد کی نامزدگی کے چار سال بعد (۶۰ھ میں) حضرت معاویہؓ نے انتقال فرمایا اور یزید نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لے کر حاکم مدینہ کو حکم بھیجا کہ عمائدین مدینہ خاص کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ' عبداللہ بن زبیرؓ اور حسین بن علیؓ جنہوں نے ولی عہدی کی بیعت نہیں کی تھی' ان سے اب خلافت کی بیعت لی جائے (چوتھے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا اس وقت انتقال ہو چکا تھا)۔ حاکمِ مدینہ نے اہل الرائے کے مشورے سے طے کیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں تو کسی جلدی کی ضرورت نہیں ہے' بے ضرر ہستی ہیں' البتہ باقی دونوں حضرات کے بارے میں عجلت اور چوکسی کی ضرورت ہے۔ مگر یہ دونوں حضرات کچھ حاکم کی نرمی اور کچھ اپنی حکمت عملی کی وجہ سے اس بیعت سے بچنے اور مدینے سے نکل کر مکّے پہنچ جانے میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا تو پیچھا بھی کرنے کی کوشش حکومت کی طرف سے کی گئی جو کامیاب نہ ہو سکی' مگر

حضرت حسینؓ کے بارے میں کسی تعاقب کی روایت نہیں پائی جاتی۔

شعبان ۶۰ھ کے پہلے ہفتہ میں مکّہ معظّمہ پہنچ جانے کے بعد ۸ ذی الحجہ تک حضرت حسینؓ کا قیام وہیں رہا اور اس درمیان میں رمضان المبارک سے اہل کوفہ کے وفود اور خطوط آپ کے پاس آنا شروع ہو گئے' جن میں کوفہ آ کر ان لوگوں کی سربراہی سنبھالنے کی درخواست تھی اور یقین دلایا گیا تھا کہ سارا کوفہ آپ کے ساتھ ہے' جیسے ہی آپ آئیں گے یہاں کے یزیدی حاکم کو نکال باہر کر دیا جائے گا۔ آپ نے پوری طرح اطمینان حاصل کرنے کے لئے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا اور ان کی طرف سے اطمینان کا خط آنے پر حج سے ایک دن پہلے ۸ر ذی الحجہ کو آپ کوفہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ لیکن ٹھیک اسی ۸ر ذی الحجہ کو' جبکہ حضرت حسینؓ کوفہ والوں کے اعتماد پر سفر کا قدم اٹھا رہے تھے' مسلم بن عقیل کوفہ والوں کی بے وفائی کا شکار ہو کر حاکم کوفہ عبیداللہ بن زیاد کی گرفت میں آ چکے تھے' اور دوسرے ہی دن ان کی زندگی کا چراغ بھی گل کر دیا گیا تھا۔ حضرت حسینؓ کو اس کا پتہ راستے کی کافی منزلیں طے کرنے کے بعد چلا۔ اس پر آپ نے واپسی کا ارادہ فرمایا مگر برادرانِ مسلم کے جذباتِ انتقام آڑے آ گئے (جو یہ چاہتے تھے کہ یا بدلہ لیں گے یا مر جائیں گے)۔ چنانچہ آپ سفر جاری رکھنے پر مجبور ہوئے۔ اور پھر دوسری بار جب آپ نے یہی ارادہ کوفے سے کچھ قریب پہنچ کر اُس وقت کیا جب آپ کو اس بات کی مزید شہادت ملی کہ کوفہ تو پوری طرح عبیداللہ بن زیاد (حاکم کوفہ) کی گرفت میں ہے اور آپ صرف گرفتار ہو کر ہی اندر جا سکتے ہیں' تب واپسی کے لئے کوئی گنجائش اور کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی۔ آپ کی گرفتاری کے لئے فوجی دستے حرکت میں آ چکے تھے۔ آپ نے اُس وقت فوری طور پر ایک غیر معمولی فیصلہ کیا' یعنی اپنا رخ یزید کے دارالخلافہ دمشق کی طرف موڑ دیا۔ مگر ان فوجی دستوں نے پیچھا کر کے آپ کو جلد ہی رک جانے پر مجبور کر دیا جو ابن زیاد کے حکم کے ماتحت چاہتے تھے کہ آپ کوفہ چلیں۔ یہی جگہ جہاں آپ کو قدم روک لینے پڑے اور جسے آپ کی شہادت گاہ بننا مقدر تھا' کربلا کے نام سے جانی جاتی ہے۔

فوجی دستوں کے سردار عمر بن سعد بن ابی وقاص جن کے بارے میں روایتیں یہ تاثر دیتی ہیں کہ ان کے دل میں حضرت حسینؓ کے لئے نہایت نرم گوشہ تھا' انہوں نے اندھا دھند کوئی کارروائی کرنے کے بجائے معاملے کو پُرامن طریقے سے سلجھانے کی کوشش میں حضرت حسینؓ سے رابطہ قائم کیا اور آپ کی طرف سے یہ خواہش سامنے آنے پر کہ آپ کی تین باتوں میں سے کوئی ایک قبول کر لی جائے۔ یعنی:

۱) واپس ہونے دیا جائے

۲) یزید کے پاس جانے دیا جائے یا لے چلا جائے۔

۳) کسی مملکت کی سرحد پر بھیج دیا جائے جہاں آپ مقیم ہو جائیں اور جہادی مہمات میں حصہ لے کر عمر گزاریں۔

عمر بن سعد نے ابن زیاد (حاکم کوفہ) کو اس کی اطلاع اس طور سے بھیجی کہ جیسے یہ ایک نہایت عمدہ اور قابل قبول بات ہو۔ روایتوں کے مطابق ابن زیاد کو بھی اس صورت حال سے خوشی ہوئی مگر شمر جیسے مشیران نے اس کی رائے پلٹ دی بلکہ عمر بن سعد سے بھی اس کو کچھ بدگمان کر دیا جس کے نتیجے میں شمر ہی کو بھیجا گیا کہ وہ عمر سے اصل حکم کی تعمیل کرائے' یعنی مفاہمت سے یا طاقت سے' جس طرح بھی ممکن ہو حسین اور ان کے ہمراہیوں کو زندہ یا مردہ گرفتار کر کے کوفہ لایا جائے اور یہ چیز اس قتل و قتال کا موجب بن گئی جس نے کربلا کا نام امر کر دیا۔

کربلا کے میدان کا واقعہ بہت سادہ اور بہت مختصر ہے۔ اور جتنے قصے کہانیاں اس سلسلے میں بیان کی جاتی ہیں جب ان کی جانچ اس وقت اور ماحول کے امکانات و مواقع' روایتوں کے تقابل' انسانی فطرت اور حضرت سیّدنا حسینؓ اور ان کے اہل بیت کے دینی شعور کی روشنی میں کی جاتی ہے تو یہ تمام کے تمام قصے ایک ایسی من گھڑت داستان بن کر رہ جاتے ہیں جسے بس ابن سبا یہودی کے شیطانی منصوبے کے مطابق ہی گھڑا جا سکتا تھا۔

کوفے کا دروازہ بند پا کر اوّلاً حضرت حسینؓ کی طرف سے خود اپنی کوشش کہ یزید

کے پاس دِمشق چلے جائیں اور اس میں رکاوٹ پڑنے کے بعد رکاوٹ ڈالنے والی کوفی فوج کے سردار عمر بن سعدؓ کو ان تین باتوں کی پیش کش جن میں سے ایک یہ تھی کہ آپ کو یزید کے پاس بھیج دیا جائے' اس کے بعد حاکم کوفہ کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہتا تھا کہ ان باتوں پر غور کرنے سے پہلے اپنی اطاعت قبول کرنے کی شرط عائد کرے اور کوئی بے جواز وجہ بھی حقیقت میں ایسی نظر نہیں آتی جس سے یہ سوال حل کیا جا سکے کہ جب بات یزید کے ہاتھ میں جا رہی تھی' اور ایک بھاری مسئلہ بغیر قتل وقتال کے طے ہونے کے پورے امکانات پیدا ہو گئے تھے تو ابن زیاد نے ایک قتل وقتال کو دعوت دینے والی یہ شرط کیوں عائد کر دی؟..... لیکن اس کہانی میں یہی تنہا ایک مقام نہیں ہے جس کا عقدہ حل کرنے سے عقل عاجز رہی جاتی ہو۔ ہم نے حضرت حسینؓ کے اعزہ واحباب اور خیر خواہ بزرگوں میں کتنوں ہی کو پایا ہے کہ وہ کوفے کی طرف آپ کے ارادۂ سفر سے حیران و پریشان ہیں اور ان کی بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ ارادہ کیسے ایک مناسب ارادہ ہو سکتا ہے؟ اور انہیں اس اظہار حیرانی پر کوئی ایسا جواب بھی نہیں ملتا کہ کچھ مطمئن ہو سکیں۔ (اور آج بھی آدمی خالی الذہن ہو کر پورے قصے کو پڑھے تو وہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا' یہ الگ بات ہے کہ کوئی اس کے اظہار کو بے ادبی سمجھے۔) حضرت حسینؓ اور یزید کے قصے پر غور کرنے والے اہل علم وفکر میں سے امام ابن تیمیہؒ نے بھی اس مشکل کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے اور پھر وہ یہ خیال پیش کر کے اسے حل کرتے ہیں کہ:

> ''حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے لئے اللہ کے یہاں سعادت اور نیک بختی کا وہ بلند مرتبہ طے ہو چکا تھا جس کے لئے کسی نہ کسی طرح کی مصیبت سے گزرنا لازم ہے۔ مگر ان دونوں کو اپنے دیگر اہل بیت کے برخلاف اس کے مواقع حاصل نہ ہو سکے تھے۔ ان کی زندگی اسلام کی اور عزت و عافیت کی گود میں بسر ہوئی تھی۔ بس اس لئے ہی ایسا ہوا کہ ایک بھائی کی موت زہر خورانی سے اور دوسرے کی مظلومانہ قتل سے ہوئی تاکہ اس کے صلہ میں وہ شہداء کا عیش اور اہل سعادت کی منزلت پا سکیں۔''

یعنی اس نہ سمجھ میں آنے والے پورے قصے کا راز ان کے خیال کے مطابق یہ تھا کہ

حضرت حسین مرتبۂ شہادت پر فائز ہوں۔ ورنہ یہ قصہ پیدا ہونے کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ یا تو حضرت حسینؓ اپنے ہمدردوں کی رائے کے مطابق کوفے کے سفر سے رک گئے ہوتے اور یا پھر ابن زیاد بے وجہ کی ضد پر آمادہ نہ ہوا ہوتا۔

اس قتلِ ناحق میں یزید کا کیا کردار ہے؟..... اگر بے لاگ انصاف کی نظر ڈالی جائے اور کم از کم شبہے کا فائدہ جو ہر ملزم کو دیا جاتا ہے' یزید کو بھی دیا جائے تو اس کا کوئی کردار اس معاملے میں ثابت نہیں ہوتا۔ اور اس کی سب سے کھلی اور سامنے کی دلیل خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی آخری وقت کی یہ کوشش اور خواہش ہے کہ آپ کو یزید کے پاس پہنچ جانے کا موقع مل جائے! اگر آپ کے لئے ذرا بھی اس خیال و گمان کی گنجائش ہوتی کہ کوفے کی سرکار (انتظامیہ) کی طرف سے جو کچھ آپ کے ساتھ معاندانہ اور سنگدلانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے اس میں یزید کی مرضی شامل ہے تو آپ کی طرف سے اس سرکارِ کوفہ کے نمائندوں کو یہ پیش کش بالکل ناقابل قیاس تھی کہ میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے کو تیار ہوں۔ ابن زیاد کے ہاتھ اور یزید کے ہاتھ میں یہ تفریق تو آپ اسی اعتماد کی بنیاد پر کر سکتے تھے کہ آپ کی طرف سے مصالحانہ رویّہ سامنے آنے کے بعد یزید کی طرف سے کسی غیر شریفانہ رویہ کا سوال نہیں ہے۔

اور یہی حقیقت ان روایتوں کو محض خرافات ثابت کرنے کے لئے بھی کافی ہے جو بتاتی ہیں کہ سانحۂ شہادت کے بعد حضرت حسینؓ کا سر مبارک اور آپ کے باقیات اہلِ بیت کو یزید کے پاس پہنچایا گیا تو اس نے توہین اور طعن و تشنیع کا رویہ اختیار کیا۔ ویسے یہ روایتیں فنی معیار پر بھی خرافات ہی ثابت ہوتی ہیں جیسا کہ متعلقہ باب میں ان پر کی گئی بحث سے بالکل صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔

واقعہ کربلا کو عام طور پر ہم سُنّیوں کے یہاں بھی ہر سال اس تصور کے ماتحت بطور ایک معرکۂ حق و باطل یاد کیا جاتا ہے کہ ایک فاسق و فاجر نے اسلامی تخت خلافت پر قبضہ کر لیا تھا جس سے آزاد کرانے کی خاطر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے تلوار اٹھائی

کی ٹھانی۔ مگر اسی میدان کا ایک اور مرد بھی' جس کا نام عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہما) ہے' جس نے یزید سے لے کر عبدالملک بن مروان تک کے اموی حکمرانوں کے خلاف بارہ برس تک تلوار چلائی اور جب تک سر ہی تن سے جدا نہ ہو گیا تلوار اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹی' پر اس کی شہادت (جمادی الاولیٰ ۷۳ھ) کا دن آنے پر اسے اور اس کی معرکہ آرائیوں کو یاد کرنے کا دستور ہم نے کہیں نہیں دیکھا! اور پھر اسی کی معرکہ آرائیوں کے دور میں واقعۂ کربلا کے تین سال بعد وہ واقعۂ حرہ پیش آتا ہے جس میں بلا کسی اختلاف روایت کے یزید ہی کے حکم سے مدینہ منورہ (زادھا اللہ تشریفا و تکریما) تاراج ہوا اور ساکنانِ مدینہ پر تین دن مسلسل قیامت ٹوٹی۔ مگر ہم نے نہیں دیکھا کہ جب وہ دن سال میں' عشرۂ محرم کی طرح' لوٹ کر آتے ہوں تو ان کی یاد میں بھی کوئی روتا ہو اور ان دنوں کے حوالے سے بھی یزید کو فاسق و فاجر اور ملعون و مردود بتانے کے لئے جلسوں اور مجلسوں کا اہتمام ہوتا ہو! حالانکہ یہی وہ موقع تھا کہ اس کے حوالے سے یزید کو فاسق و فاجر وغیرہ کچھ بھی کہا جاتا تو اس کا جواز فراہم تھا۔ مگر وہ دن تو کسی کو بھی بھول کر یاد نہیں آتے۔ رہے شیعہ تو وہ کہاں اس کے یاد کرنے والے۔ اس سے تو ان کا کام بگڑتا۔ ہاں اگر حضرت علی بن الحسینؒ (زین العابدینؒ) کو خدانخواستہ اس قصے میں کچھ ہو جاتا تو بے شک یہ دن بھی محرم والا مقام پا لیتے مگر ان کے بارے میں یزید کی اپنے کمانڈر کو سخت ہدایت تھی کہ کسی طرح کا گزند نہ پہنچے۔ سو الحمدللہ آپ عافیت سے رہے۔

پتہ نہیں ہم میں سے کتنے ہوں جو اس بہتّر (۷۲) سالہ جواں مرد (عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما) کو کچھ ٹھیک سے جانتے بھی ہوں۔ وہ بذات خود کچھ کم صاحب فضائل آدمی نہ تھے۔ جہادی معرکوں سے تو کتاب زندگی بھری ہوئی تھی ہی' ذوق عبادت کا بھی عالم یہ تھا کہ شہادت کی خبر پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی جو ان کی یزید وغیرہ کے خلاف معرکہ آرائی کو پسند نہیں کرتے تھے "صوّام وقوّام" (شب زندہ دار اور دن کے روزہ دار) کے حوالے سے اظہار افسوس کیا ہے۔

رہا نسب تو باپ کی طرف سے آپ بیٹے تھے آنحضرت ﷺ کے پھوپھی زاد حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے' جو حواریٔ رسول کا لقب رکھتے تھے اور ان دس صحابہ میں سے ایک تھے جنہیں جنت کی بشارت ملی۔ اور ماں کی طرف سے حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیق (رضی اللہ عنہما) کی اولاد' جو بنت صدیق ہونے کے علاوہ ''ذات النطاقین'' کا وہ لقب بھی رکھتی تھیں جس سے آنحضرت ﷺ کے سفر ہجرت کی ایک خاص یاد وابستہ ہے۔ مرد میدان ہونے کا عالم یہ تھا کہ بہتر سال کی عمر میں بھی اکیلے رہ جانے کے باوجود دشمن کی فوج قابو پانے سے عاجز تھی۔ اور اس لئے جب یہ شیر مرد پتھروں کی چوٹ کھا کر گرا اور پھر دشمن قابو پا سکا تو یہ اتنی بڑی کامیابی دشمن کو لگی کہ نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔ یاد آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جب یہ تکبیر سنی اور وجہ معلوم ہوئی تو فرمایا کہ یہی وہ تھا جس کی پیدائش پر بھی مدینے میں تکبیر بلند ہوئی تھی۔ کیونکہ مہاجرین کے گھر میں یہ پہلی پیدائش تھی۔ اور غیر معمولی خوشی کا سبب یہ تھا کہ یہود مدینہ نے یہ شہرت دے رکھی تھی کہ ان کے عاملوں نے مہاجر ماؤں کے رحم بند کر دیئے ہیں۔

الغرض یہ تھے عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہما) جو ہمیں یزید دشمنی کے حوالے سے بھی کبھی یاد نہیں آتے۔ پھر بھی خبردار جو ہمیں شیعیت کا عیب لگایا' خبردار جو قصہ کہانیوں سے پردہ اٹھایا۔ ع طائروں پر ہے سحر صیاد کے اقبال کا!

(انتخاب از ماہنامہ الفرقان لکھنؤ)

ضرورت رشتہ

ساٹھ سالہ' صحت مند اور اعلیٰ تعلیم یافتہ امریکی شہری کے لیے رفیقہ حیات کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر یا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ مذہبی رجحانات رکھنے والی خاتون قابل ترجیح ہوگی۔ بیوہ یا مطلقہ معزز خاتون دو بچوں کے ساتھ بھی قابل قبول ہے۔ ذات پات کی کوئی شرط نہیں۔

رابطہ: 421 پاک بلاک' علامہ اقبال ٹاؤن' لاہور۔ فون: 7840053

پاکستان اور عدلیہ کی آزادی

رياض الحسن نوری ☆

تمام جمہوری ملک آئین کی رو سے عدلیہ کو آزاد قرار دیتے ہیں اور پاکستان میں بھی آئین میں عدلیہ کی آزادی کا بطور خاص ذکر ہے۔ آیئے دیکھیں کہ پاکستان میں صحیح پوزیشن کیا ہے۔

قرارداد مقاصد جو اب باقاعدہ آرٹیکل 2(a) کے تحت آئین کا حصہ بن چکی ہے' اس کے شروع میں درج ہے کہ تمام دنیا پر ساورنٹی یعنی حاکمیت صرف خدا تعالیٰ ہی کو حاصل ہے اور جو اتھارٹی حکومت پاکستان کو عوام کے ذریعے حاصل ہوتی ہے وہ ایک مقدس امانت ہے جو خدا تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہی استعمال کی جاسکتی ہے۔ مزید یہ کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے مطابق گزارنے کے قابل بنایا جائے گا' جیسا کہ قرآن و سنت میں درج ہے۔ آخری حصے میں یہ درج ہے کہ عدلیہ کو مکمل آزادی حاصل رہے گی۔

حقیقت حال کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی بجائے ہم سابق صدر پاکستان غلام اسحاق خان کے اس بیان کو نقل کرتے ہیں جو انہوں نے ۶ ستمبر ۸۹ء کو ملتان میں زکریا قومی کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے کیا:

> ''قوم ہر دور میں اسلام سے اپنی غیر مشروط وابستگی کا اظہار کرتی رہی ہے۔ ہر حکومت اسلام کا نام لیتی رہی ہے' مگر اس کے باوجود آج بھی اسلام عملاً طاق پر رکھا ہوا نظر آتا ہے۔ ہونے کو تو ملک اسلامی جمہوریہ ہے اور اس کے آئین کی روح بھی اسلامی ہے' زبان سے ہر کوئی لا الٰہ الا اللہ کا ورد بھی کرتا ہے مگر افسوس کہ دل و نگاہ مسلمان نہیں' سوچ کے انداز' عمل کے طور طریقے مؤمنانہ نہیں۔ ہم نے دوسری ترجیحات کو اس طرح اعصاب پر سوار کر لیا ہے کہ نفاذ اسلام کے لئے زبانی جمع خرچ میں بھی بخل سے کام لیتے ہیں۔'' (۱)

☆ مشیر وفاقی شرعی عدالت و ریسرچ سکالر رابطہ عالم اسلامی مکہ

جب آئین میں تسلیم کرلیا گیا کہ ساورن خدا ہے اور بانیٔ پاکستان نے اعلان کر دیا کہ وفاکیشی اور فرماں برداری کا مرجع خدا کی ذات ہے'[۲] مزید یہ کہ جب ساورن کا اپنا حکم نامہ قرآن کریم موجود ہے جس پر ایمان رکھنے کا حلف صدر اور وزیر اعظم اٹھاتے ہیں تو قرآن کریم خود بخود سپر آئین اور سپر لاء قرار پا گیا' جس کی پابندی ہر ایک پر لازمی ہے۔ عدلیہ کو آزادی بھی خود بخود حاصل ہے کہ وہ قرآن وسنّت کے دائرے میں آزادانہ فیصلے کرے۔ عدلیہ کے لئے ان قوانین کی پابندی ہرگز جائز نہیں جو چاہے پارلیمنٹ نے بنائے ہوں مگر قرآن کے مطابق نہ ہوں۔

انگریزی حکومت کے ابتدائی دَور میں مقدمات کے فیصلے مدت تک اسلامی فقہ کے مطابق رہے۔ اس دور کی مشہور کتاب ''کتاب الاختیار'' کے اردو ترجمہ کے صفحہ ۱۹ پر لکھا ہے کہ قاضی کا فیصلہ قرآن کے مطابق ہونا چاہئے' اگر قرآن کا فیصلہ نہ ملے تو حدیث کے مطابق فیصلہ کرے۔ گویا پاکستانی دَور انگریزوں کے ابتدائی دَور سے بھی بدتر ہے کہ عدالتوں کو قرآن کی بجائے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کا پابند کر دیا گیا ہے۔ حکمرانوں کے حلف اور پھر اس کے خلاف عمل کو کھلی منافقت کے علاوہ کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ خدا' رسول اور بانیٔ پاکستان سے واضح غداری ہے' کیونکہ بانیٔ پاکستان نے' جو برصغیر میں چوٹی کے ماہر قانون تھے' فرمایا:

''قرآن ہمارا مذہبی' سوشل' سول' کمرشل' ملٹری' جوڈیشل' کریمنل' پینل ہر قسم کا کوڈ ہے''۔[۳]

سیّد شریف الدین پیرزادہ لکھتے ہیں کہ نواب بہادر یار جنگ نے بانیٔ پاکستان کی صدارت میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ تمہارے عظیم قائد نے ایک سے زیادہ مرتبہ اعلان کیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی کسی ریاست کے آئین یا قوانین بنانے کا کوئی حق نہیں۔ آئین کے قوانین یقینی طور پر قرآن میں درج ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم پاکستان اس لئے بنانا چاہتے ہیں کہ قرآن کا نظامِ حکومت قائم کریں۔ انگریزی الفاظ یوں ہیں:

Your Quaid-i-Azam has proclaimed more than once

that the Muslims have no right to frame the constitution and law of any of their states. The laws governing the constituion are definitely laid down in the Holy Quran. We want to establish the Quranic system of Government..... Only that system will suit us which is based on Quran and the Traditions and which will produce true Muslims.(۴)

یعنی ہمارے لئے وہی قانون صحیح اور مناسب رہے گا جو قرآن اور سنّت پر مبنی ہو جو کہ سچے مسلمان پیدا کرے گا۔ آگے صفحہ ۴۸۶ پر لکھا ہے کہ:

The abolition of interest at out the roots of usury..... The system of Zakat which is a tax on capital and not on income, is the greatest of all taxes that modern civilized countries have levied on their people. In view of this flawless economic system can we care to cast a look at any other system!

یعنی سود کو ختم کرنے سے اس کی سب جڑیں ختم ہو جائیں گی..... زکوٰۃ جو دولت پر ٹیکس ہے' آمدنی پر مبنی نہیں ہے' یہ ان تمام ٹیکسوں سے بڑھ کر ہے جو کہ مہذب ملکوں نے اپنے لوگوں پر نافذ کئے ہیں۔ اس نقائص سے پاک اور بہترین اقتصادی نظام کے ہوتے ہوئے کیا ہم کسی دوسرے نظام کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی پروا کر سکتے ہیں!

اوپر جو بانیٔ پاکستان کا یہ قول بیان ہوا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی کسی حکومت کا آئین بنانے کا حق نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی اور بنیادی آئین کا حق نہیں ہے' کیونکہ بنیادی اور اعلیٰ آئین خود ساورن کا مقرر کردہ قرآن کریم موجود۔ البتہ ضرورت کے مطابق قرآن وسنّت کی روشنی میں ذیلی آئین یا ذیلی قوانین بنائے جا سکتے ہیں جو قرآن وسنّت کے مطابق ان دونوں کی تشریحات ہوں گی۔ ایسی کوئی شق یا قانون بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو قرآن کے مطابق نہ ہو یا قرآن کے خلاف ہو۔

بانیٔ پاکستان نے قرآن کریم کے آئین ہونے کا اصول اقبال سے لیا ہے۔

اقبال کی کلیات کی مشہور نظم ہے جس کی سرخی یہ ہے: ''درمعنی ایں کہ نظام ملت غیر از آئین صورت نہ بندد و آئین ملّتِ محمد یہ قرآن است'' یعنی آئین کے بغیر بات نہیں بنتی اور ملت محمدیہ کا آئین قرآن ہے۔

اب حکومت کو چاہئے کہ یا تو قرآن کریم کو سپر آئین اور سپر قانون تسلیم کرے کہ وہ آئین میں تسلیم کردہ ساورن کا حکم نامہ ہے' ورنہ بانیٔ پاکستان اور علامہ اقبال کی ان تمام تحریروں کو ضبط کرے جن میں قرآن کو آئین اور خدا تعالیٰ کو وفا کیشی اور فرماں برداری کا مرجع قرار دیا گیا ہے۔ بانیٔ پاکستان کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اسے خلافت راشدہ کا نمونہ بنائیں تاکہ خدا اپنا وعدہ پورا کرے اور مسلمانوں کو زمین کی بادشاہت دے۔ (۵)

حکومت کو چاہئے کہ جہاں جہاں بانیٔ پاکستان کے معالج ڈاکٹر ریاض علی شاہ کا یہ بیان موجود ہو اُن تحریروں کو بھی خلافِ قانون قرار دے کر ضبط کرے۔ اگر حکومت ایسا نہ کرے گی تو لوگ اسے غدار حکومت کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں جو کہ منافقانہ طور پر قرآن و سنّت پر ایمان کا حلف اٹھاتی ہے۔ علامہ اقبال کے نام پر ایوانِ اقبال بناتی ہے مگر اُن کے اعلان کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ بانیٔ پاکستان کی تصویر نوٹوں پر چھاپتی ہے مگر ان کے واضح اعلانات کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتی ہے۔ اس سارے عمل پر ہمیں امریکہ کی چھپی ہوئی کتاب یاد آتی ہے جس کا نام ہے "Death of Common Sense" اس کے مصنف کا نام فلپ کے ہاورڈ ہے۔ اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ امریکہ کے بہت سے قوانین عقلِ سلیم کے خلاف ہیں۔ یہ کتاب رینڈم ہاؤس نیویارک کی مطبوعہ ہے۔

جب کوئی ہندو مسلمان ہوتا ہے تو وہ حلف اٹھا کر کلمہ نہیں پڑھتا بلکہ بغیر حلف کے صرف زبانی کلمہ پڑھتا ہے اور قرآن پر ایمان لانے کا بغیر حلف کے زبانی ذکر کرتا ہے' مگر اس کے بعد وہ کبھی بتوں یا دیوی دیوتاؤں کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ مگر ہمارے حکمران قرآن وسنّت پر ایمان لانے کا حلف اٹھاتے ہیں' آئین پر عمل کا حلف اٹھاتے

ہیں جس میں لکھا ہے کہ تمام کائنات کا حاکم مطلق خدا تعالیٰ ہے' مگر اس کی کتاب کو چھوڑ کر انسانوں سے قوانین بنواتے ہیں جو حاکم مطلق کی کتاب کے مطابق نہیں ہوتے' بلکہ بہت دفعہ خلاف ہوتے ہیں۔ اس کو کھلم کھلا فراڈ' دھوکہ اور حلف کو مذاق بنانے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ قرآن میں صاف لکھا ہے کہ ﴿لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖ اَحَدًا﴾ یعنی احکامات کے معاملہ میں خدا کا کوئی شریک نہیں۔ مگر حکمران اس معاملے میں پارلیمنٹ اور صدر کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ یہ ایسا ہی تماشہ ہے جیسے کہ مشہور کہانی ہے کہ کچھ چال بازوں نے ایک بادشاہ سے کہا کہ ہم تمہارے لئے ایسا لباس بنوائیں گے جو سوائے ایمان دار اور نیک لوگوں کے کسی کو نظر نہ آئے گا۔ پھر بادشاہ وہ نظر نہ آنے والا لباس پہن کر سڑک پر پھرتا رہا مگر کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ یہ کہہ سکے کہ بادشاہ تو ننگا ہے۔

پاکستان میں عدلیہ آزاد نہیں

جب پاکستان کے ججوں کو انسانوں کا بنایا ہوا قانون تھما دیا جاتا ہے جس کو پارلیمنٹ بناتی ہے جس میں ہر جرم کی سزا مقرر کر دی گئی ہے اور عدلیہ اس قانون میں مقرر کردہ سزا کے سوائے کوئی دوسری سزا نہیں دے سکتی تو آزادی تو ختم ہو گئی۔ حکومت نے جب عدلیہ کے ہاتھ باندھ دیئے ہیں تو پھر عدلیہ کے آزاد ہونے کا ذکر دھوکہ ہے۔ اسلام میں حدود کی سزا تو مقرر ہے مگر تعزیر میں قاضی آزاد ہوتا ہے کہ وہ مناسب اور صحیح فیصلہ کرے۔ پھر حکومت نے جو حدود آرڈی نینس بنائے اس میں غیر شادی شدہ مرد کے لئے زنا بالجبر اور عورت کی رضامندی سے زنا دونوں کی سزا ایک ہی مقرر کر دی' یعنی سو کوڑے۔ اس غلطی پر راقم الحروف نے شرعی عدالت کے مرحوم چیف جسٹس گل محمد خان کی توجہ عورت کی شہادت کے مقدمہ میں دلائی تو انہوں نے اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے فیصلہ دیا کہ زنا بالجبر پر محاربہ کی آیت لاگو ہوتی ہے' کیونکہ زنا بالجبر بہت بڑا فتنہ ہے اور قرآن میں ہے کہ: ﴿اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ اور ﴿اَلْفِتْنَۃُ اَکْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾ تفصیل شرعی عدالت کے عورت کی شہادت کے مقدمہ کے فیصلہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مزید حدود آرڈی نینس میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا تو درج کر دی گئی مگر ججوں کے دلوں میں بٹھا دیا گیا کہ یہ سزا نہ دی جائے۔ پس آج تک ہماری عدالتوں کو کسی ایک چوری کا بھی صحیح ثبوت نہ مل سکا اور آج تک پاکستان میں یہ سزا کسی کو نہ دی گئی' جبکہ سعودی عرب میں بہت سے چوروں کو یہ سزا دی جا چکی ہے۔ پس ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ سعودی عرب میں عدلیہ پاکستان سے زیادہ آزاد ہے۔ وہاں کے جج ہیروئن فروخت کرنے والے کو موت کی سزا دیتے ہیں اور وہ مغربی دانشوروں کے اعتراضات کی پروا نہیں کرتے۔

امریکہ میں سپریم کورٹ آزاد اور سپریم ہے

جیرالڈ ڈبلیو جانسن "Parliament and the Supreme Court" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"We say the congress makes the law and the President enforces it. Yet the people allow nine men, indeed, five out of nine, to say that a law passed by the Congress and the President is no law and, nobody need obey it ..... while inferior courts must be courts of law, the highest of all should be a court of justice ..... A court of justice, however, must say 'This is just' and if it cannot do so because of law, it must strike down the law" (۶)

''ہم کہتے ہیں کہ کانگریس قانون بناتی ہے اور پریذیڈنٹ اسے نافذ کرتا ہے' مگر لوگ نو آدمیوں کو' بلکہ نو میں سے پانچ آدمیوں کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ یہ فیصلہ دے دیں کہ جو قانون کانگریس (پارلیمنٹ) اور پریذیڈنٹ نے بنایا ہے یہ کوئی قانون نہیں ہے اور کسی کو اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ ماتحت عدالتوں کو قانون کی عدالتیں ہونا چاہئے مگر سب سے بڑی عدالت کو انصاف کی عدالت ہونا چاہئے ـــــ انصاف کی عدالت کے لئے یہ کہنا ضروری ہے کہ ''انصاف یہ ہے'' اور اگر وہ قانون کی وجہ سے ایسا نہیں کہہ سکتی تو اسے قانون کو مار کر گرا دینا چاہئے' یعنی ختم کر دینا چاہئے''۔

ہم اس مضمون کو سابق صدر غلام اسحاق خان کی تقریر کے اس آخری حصہ پر ختم کرتے ہیں جو انہوں نے بطورِ صدر کی تھی

''ہماری مشکلات کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم خلوصِ نیت کے ساتھ اس نسخۂ کیمیا کو نہیں آزماتے جو عالمین کے لئے رحمت بن کر آنے والے نبی برحق ﷺ نے ہمیں دیا ہے۔ ہم قوم میں اتحاد اور اخوت پیدا کرنے کی اس بے پناہ قوت کو روبہ عمل لانے کی سنجیدہ کوشش نہیں کرتے جو مذہب کو حاصل ہے۔ اگر ہم من حیث القوم صدق دل سے اللہ کی طرف مراجعت کریں تو اللہ ہمیں ایک بار پھر باہم شیر وشکر کر دے گا''۔ (۷)

پس کیا موجودہ حکومت قرآن وسنّت کے قوانین کو نافذ کر کے فرقہ واریت کو ختم کرے گی اور تمام مشکلات کی جڑ بنیاد اور سبب کو دُور کرے گی؟

حواشی

۱) روزنامہ جنگ' ۶ ستمبر ۱۹۸۹ء

۲) گفتار قائد' ص ۲۶۲

۳) سپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح' مرتبہ: جمیل الدین احمد' ج ۲' ص ۲۰۸' ۲۰۹' مطبوعہ شیخ اشرف ۱۹۶۸ء

۴) فاؤنڈیشنز آف پاکستان' آل انڈیا مسلم لیگ ڈاکومینٹس (۱۹۰۶ء تا ۱۹۴۷ء) مرتب کردہ: سیّد شریف الدین پیرزادہ ۱۹۷۰ء' ۲/۴۸۵' نیشنل پبلشنگ ہاؤس' کراچی۔ ڈھاکہ

۵) روزنامہ جنگ' ۱۱ ستمبر ۱۹۸۸ء

۶) دیکھئے مصنف کی کتاب: دی سپریم کورٹ' ص ۲۹' ۳۰' مطبوعہ نیویارک

۷) روزنامہ جنگ' ۶ ستمبر ۱۹۸۹ء

اہم اطلاع

ہفت روزہ ''ندائے خلافت'' ماہنامہ ''میثاق'' اور ماہنامہ ''حکمت قرآن'' کے

انٹرنیٹ ایڈیشن

تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ **www.tanzeem.org** پر مطالعے کے لئے دستیاب ہیں۔

اسلامی نظامِ خلافت ضروری کیوں؟

محبوب الحق عاجز

قرآن کی رو سے انسان زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے' مالک اور حاکم نہیں! ملکیت اور حاکمیت کا حق صرف اس خدائے واحد و یکتا کو حاصل ہے جس نے اس وسیع و عریض کائنات کو پیدا کیا ہے۔ جمہور کی حاکمیت کا مغربی تصور بالکل باطل اور بے بنیاد ہے۔ بقول اقبال ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

ملکیت اور حاکمیت کا یہی تصور نظامِ خلافت کی اساس ہے۔ اس نظامِ خلافت کا مکمل تشکیلی ڈھانچہ کیا ہے' یا اس کے خدوخال کیا ہیں؟ یہ سوال طویل جواب کا متقاضی ہے جس کا یہاں محاکمہ ممکن نہیں' مگر اتنا عرض کر دوں کہ قصرِ خلافت چار بنیادی ستونوں پر استوار ہے جو درج ذیل ہیں:

۱) اللہ' اُس کے رسول اور اولوالامر کی اطاعت
۲) نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون
۳) عدل و انصاف کا قیام
۴) مسائلِ حاضرہ کے حل کے لئے قرآن و سنّت کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے اجتہاد کا عمل

نظامِ خلافت کی ماہیت اور نوعیت اور اس کے راہنما اصولوں کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آئیں گے کہ اس کی ضرورت و اہمیت کیا ہے؟

نظامِ خلافت دین کا اہم تقاضا ہے

اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے۔ توحید محض ایک عقیدہ (Dogma) ہی نہیں بلکہ ایک مکمل نظریۂ حیات ہے جو اعتقادی' نظریاتی' مذہبی' ثقافتی' معاشی اور معاشرتی

سطح پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا نام ہے۔ اسلام دیگر مذاہب کی طرح محض رسوم و رواج اور چند مراسم عبودیت کے مجموعے ہی کا نام نہیں بلکہ انسانی زندگی کے جملہ انفرادی اور اجتماعی شعبوں سے متعلق واضح احکامات دیتا ہے۔ اس کا اپنا ایک مکمل دستورِ حیات ہے جو قرآن ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾ (المائدۃ:۴۸)

''اور ہم نے تم میں سے ہر ایک کو ایک دستور اور راہ دی ہے''۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے دین میں پورے داخلے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا:

﴿اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً﴾ (البقرۃ: ۲۰۸)

''دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ''۔

ظاہر ہے کہ دین میں پورے داخلے کے لئے ہمیں اس کی جملہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا پڑے گا اور یہ کہ دین کی اجتماعیت سے متعلق تعلیمات کا تعلق نظامِ حکومت یا اقتدار سے ہے۔ لہٰذا جب تک اجتماعی سطح پر اسلام کا نظامِ زندگی قائم اور نافذ نہیں کیا جاتا اس وقت تک ہم اسلام کی ان پاکیزہ اور فطری تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے۔ مثلاً اسلام نے معاشی شعبے میں سود کو مطلق حرام اور سود لینے کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ قرار دیا ہے مگر آج ہمارا معاشی ڈھانچہ بالخصوص بینکنگ سسٹم سودی مالیات پر مبنی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ شرعی عدالت کے سود کی حرمت کے تاریخ ساز فیصلے کے بعد بھی ہماری حکومت نہ صرف اس سے انحراف کی راہیں تلاش کر رہی ہے بلکہ بعض وزراء کی جانب سے واشگاف یہ عندیہ بھی دیا جا رہا ہے کہ سود کے بغیر ہمارا معاشی نظام نہیں چل سکتا۔ اسی طرح معاشرتی نظام کی اصلاح کی خاطر قرآن حکیم نے سارق (چور مرد) اور سارقہ (چور عورت) کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دیا ہے مگر اس حکم قرآنی کے مطابق عمل تو کجا نظری اعتبار سے بھی اسے بعض حلقوں کی جانب سے وحشیانہ سزا قرار دیا جا رہا ہے۔

سیاسی شعبے پر نگاہ ڈالیں تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ مطلق العنان مسلمان حکمران اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کی بجائے حاکمیت کا اختیار اپنے ہاتھوں میں لے کر ﴿اِنَّ الدِّيْنَ

عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ﴾ کی بجائے خود تراشیدہ اسلام اور فرسودہ ظالمانہ قوانین بندگانِ خدا پر مسلط کر رہے ہیں اور یوں اسلام میں پورے داخلے کے قرآنی حکم کی عملاً تکذیب کر رہے ہیں اور دوسری طرف کتاب کے بعض احکامات کو ماننے اور بعض کو نہ ماننے کے سبب سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ کے مصداق دنیا کی بدترین ذلت ورسوائی اور آخرت کے شدید ترین عذاب کو دعوت دے رہے ہیں۔ فرمایا گیا:

﴿اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ‌ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا‌ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ‌ؕ﴾

''تو کیا تم کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کا انکار کرتے ہو؟ تو اس شخص کا بدلہ اس کے سوا اور کیا ہونا چاہئے جو تم میں سے ایسا کرے کہ اس کے لئے رسوائی ہو دنیا کی زندگی میں بھی اور قیامت کے دن وہ شدید ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے''۔

چنانچہ ایسی صورتِ حال میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ دنیا و آخرت کے اس خسرانِ عظیم سے اپنے دامن کو بچانے کے لئے اسلام کے نظامِ اجتماعی کو قائم کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ملت اسلامیہ کو اپنے عطا کردہ دستورِ حیات قرآن حکیم کے مطابق فیصلے کرنے کا حکم دیا ہے اور ساتھ ہی بڑے سخت الفاظ میں یہ وعید بھی کر دی ہے کہ:

﴿وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ﴾ (المائدۃ: ٤٤)

''اور جو اللہ کی اتاری ہوئی (کتاب) کے مطابق فیصلے نہ کریں سو وہی تو کافر ہیں۔''

جبکہ اگلی آیت میں فرمایا:

﴿وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ﴾ (المائدۃ: ٤٥)

''اور جو اللہ کی نازل کردہ (کتاب) کے مطابق فیصلے نہ کریں سو وہی تو ظالم (مشرک) ہیں''۔

گویا ایسے لوگ اگر دعوائے ایمان رکھتے ہیں تو ان کا دعویٰ محض ایک دعویٰ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

علاوہ ازیں نظامِ خلافت کے قیام اور اعلائے کلمۃ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو عملاً زندگی کے جملہ انفرادی اور اجتماعی شعبوں میں قائم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے

اہل ایمان کو جہاد و قتال کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال: ۳۹)

''اور ان سے قتال کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور اطاعت کُل کی کُل اللہ کے لئے ہو جائے۔''

گویا توحید کے علمبرداروں، ایمان کے دعوے داروں اور داعیان اسلام پر لازم ہے کہ وہ اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لئے باطل اور طاغوتی طاقتوں سے ٹکرا جائیں اور ان کے خلاف مسلسل برسرپیکار رہ کر قتال کرتے رہیں، یہاں تک کہ شیطانی قوتیں حق کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائیں، حق کا بول بالا ہو جائے اور ''لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا'' کی منزل آ جائے۔

نظامِ خلافت کے قیام کی جدوجہد ایک اہم دینی فریضے کی حیثیت سے سورۃ الصف آیت ۹ اور سورۃ الفتح آیت ۲۸ سے مزید مؤکد اور مبرہن ہو جاتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا کہ:

﴿هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

''وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ وہ اسے تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کر دے۔''

اسی غرض سے حضرت محمد ﷺ نے ۲۳ برس کے قلیل عرصے میں تاریخ انسانی کا وہ عظیم اور ہمہ گیر انقلاب برپا کیا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ تاریخ عالم کے دو بڑے انقلابات انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس کی بدولت زندگی کے صرف ایک گوشے یعنی سیاسی اور معاشی شعبے میں تبدیلی آئی تھی مگر آپ ﷺ کا انقلاب ایسا ہمہ گیر تھا کہ زندگی کے تمام شعبوں میں تبدیلی آئی۔ عقائد بدلے، نظریات بدلے، رسم و رواج بدلے، عادات بدلیں، سوچ بدلی، نقطۂ نظر بدلا۔ الغرض سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی طرزِ زندگی میں مکمل تبدیلی آ گئی۔ بقول شاعر

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا!

اور

عرب وہ کہ تھا ایک ڈھوروں کا گلہ
گراں کر دیا اس کا عالم سے پلہ

الغرض درج بالا تصریحات سے یہ حقائق آشکارا ہوئے کہ:

اولاً: دین اسلام ایک جامع نظامِ حیات ہے جو زندگی کے جملہ انفرادی اور اجتماعی گوشوں میں تمام باطل مذاہب اور نظریات پر دنیا میں غلبہ چاہتا ہے۔

ثانیاً: اسی کے نتیجے کے طور پر یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہوئی کہ سیکولر عناصر کا یہ پروپیگنڈہ کہ اسلام اجتماعیات سے بحث نہیں کرتا اس لئے وہ سیکولرزم کا حامی ہے' قطعاً باطل اور بے بنیاد ہے۔

ثالثاً: یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ اقامت دین اور نظامِ خلافت کے قیام کی جدوجہد اُمت کا ایک نہایت اہم دینی فریضہ ہے اور ایمان کا تقاضا بھی!

رابعاً: یہ کہ جب تک اسلامی نظامِ حیات کو قومی و ملی سطح پر قائم نہیں کر لیا جاتا اس وقت تک ہم بندگیٔ رب کا حق بھی صحیح معنوں میں ادا نہیں کر سکتے' اس لئے کہ اس صورت میں صرف انفرادی گوشوں پر ہی عمل کیا جا سکتا ہے' اجتماعی تعلیمات پر نہیں۔ وہی بات جو اقبال نے فرمائی۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

نظام خلافت کا قیام ـــــ قیام پاکستان کا اوّلین تقاضا

وطن عزیز دوقومی نظریئے کے تحت حاصل کیا گیا تھا۔ اس کے حصول کا مقصد ہی یہ قرار پایا تھا کہ مسلمانانِ ہند کے لئے ایک ایسی آزاد اور خودمختار اسلامی ریاست قائم کی جائے جس میں وہ اپنی زندگیاں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے زرّیں اصولوں کے مطابق گزار سکیں اور اسلام کی پاکیزہ تعلیمات پر جو پردے دورِ ملوکیت میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی (Social Justice of Islam) کو بالفعل قائم کر کے اسلام کے اصولِ حریت و اخوت و مساوات کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

یہی وہ جذبہ تھا جو قیامِ پاکستان کا محرک بنا اور حصولِ پاکستان کی اساس بھی! اس نظریئے کے بل بوتے پر برعظیم پاک و ہند کے لاکھوں مسلمانوں نے ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد میں اپنی قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ مسلمان ماؤں بہنوں کی عصمتیں لوٹی گئیں، ہزاروں معصوم بچوں کو کرپانوں سے چھلنی کیا گیا۔ ظلم کی اس اندھیری رات میں مسلمانانِ برعظیم اللہ پر اس ایمان اور یقین کی بدولت مصائب اور صعوبتیں جھیلتے رہے کہ آخر کار حق کی صبح ضرور طلوع ہوگی اور اللہ تعالیٰ توحید کے پروانوں کو ضرور نصرت و کامرانی عطا کریں گے۔ آخر کار یوں ہی ہوا کہ اللہ پر پختہ ایمان و ایقان کی بدولت ان کی پیشین گوئیاں سچ ثابت ہوئیں۔ مسلمانوں کی قربانیاں رنگ لائیں، شہیدان اسلام کے خون سے انقلاب آ گیا، ظلم و بربریت کی تاریک رات ڈھلی، صبح کا سورج طلوع ہوا، حق و باطل کے مابین یہ کشمکش اپنے منطقی انجام کو پہنچی، حق غالب آ گیا اور باطل کو پسپائی ہوئی اور یوں اسلامیان ہند کا سنہرا خواب شرمندہ تعبیر ہوا کہ انہیں ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو وقت کی عظیم ترین آزاد اور خودمختار اسلامی ریاست مل گئی۔

اس حقیقت کے باوجود آج کچھ لوگ دوقومی نظریئے کا غلط مفہوم لے رہے ہیں اور تمام جہتوں اور مختلف حیلوں اور بہانوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ قیامِ پاکستان کا اصل مقصد اسلام کے نظامِ خلافت کا قیام نہ تھا بلکہ اس کے پس منظر میں معاشی مسائل اور قومی دفاع ہی کا جذبہ کارفرما تھا۔ ہم اس بات کا کلیتاً انکار تو نہیں کرتے کہ معاشی مسائل اور قومی دفاع کا جذبہ وطن عزیز کے قیام کے لئے محرک عمل بنا مگر اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ اس کے پس منظر میں اصل اور اساسی جذبہ محرکہ اسلام ہی کا تھا اور ثانوی اور جزوی طور پر معاشی مسائل اور قومی دفاع کا بھی! اس لئے کہ:

اولاً: ہندوستان کے ان علاقوں کے مسلمانوں کی قربانیاں اور جذبۂ جہاد جنہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد بھی بھارت ہی میں رہنا تھا یہ ثابت کرتا ہے کہ قیامِ پاکستان کے لئے ان کی قربانیاں اسلام اور صرف اسلام کے نام پر تھیں، کیونکہ پاکستان

سے ان کا معاشی اعتبار سے کوئی مفاد وابستہ نہ تھا۔

ثانیاً: قیامِ پاکستان سے قبل مسلمان مختلف فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور ان میں جمعیت کی طاقت رخصت ہوتی دکھائی دیتی تھی مگر مسلم لیگ کے نفاذِ اسلام کے نعروں کی بدولت اس کا ساتھ دینے کے لئے مسلمان اپنی نسلی و گروہی عصبیت ختم کر کے ایک ہی ملی وحدت میں جمع ہو گئے تھے۔

ثالثاً: اس لئے کہ حصولِ پاکستان کے وقت متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی زبانوں پر درۂ خیبر تا راس کماری ایک ہی نعرہ بلند ہو رہا تھا ''پاکستان کا مطلب کیا' لا الٰہ الا اللہ'' علاوہ ازیں حصولِ پاکستان سے متصلاً قبل برعظیم کے مسلمانوں نے جمعہ و عیدین کے اجتماعات میں اللہ کے حضور یہی عہد کیا تھا کہ اے اللہ! تو ہمیں آزاد خطۂ ارضی عطا کرتا کہ ہم اس میں تیرا دین قائم و نافذ کر سکیں۔

رابعاً: قائد اعظم محمد علی جناح کی سیاسی بصیرت اور مدبرانہ قیادت اور دیگر مسلم اکابرین و زعماء کی انتھک کوششوں سے پاکستان تو حاصل کر لیا گیا تھا مگر ان اکابرین کی کامیابی کا سہرا اُن اسلامیانِ ہند کے سر ہے جو معاشی و سیاسی اور تمدنی اقدار سے تو ناواقف تھے مگر جب انہوں نے سنا کہ اسلام کے نام پر ایک ریاست بننے والی ہے تو انہوں نے اپنے جذبۂ ایمان کی بدولت مسلم لیگی قیادت کا بھرپور ساتھ دیا۔ چنانچہ یہی وہ جذبہ تھا جس کے نتیجے میں دسمبر ۱۹۴۵ء میں مخصوص نشستوں پر اور فروری ۱۹۴۶ء کو صوبائی نشستوں کے انتخابات میں مسلم لیگ کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔

خامساً: قیامِ پاکستان کے فوراً بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں قراردادِ مقاصد کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کا اقرار کر لیا جانا مسلمانوں کے اس رجحان کا مُنہ بولتا ثبوت ہے کہ قیامِ پاکستان کا اصل مقصد اسلامی نظام کا نفاذ تھا۔ اسی طرح ۱۹۷۷ء میں تحریکِ نظامِ مصطفیٰ ﷺ چلی تو اس میں مسلمانوں کا بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ قیامِ پاکستان کا اصل مقصد اسلام اور صرف اسلام تھا۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائد اعظم وطنِ عزیز کو اسلامی اور مذہبی ریاست نہیں بنانا

چاہتے تھے' درست نہیں ہے' کیونکہ بانیٔ پاکستان اپنے خطبات میں قیامِ پاکستان کی جدو جہد کو نفاذِ اسلام سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر انہوں نے فرمایا:

''قرآن وسنّت مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے۔ اس میں مذہبی اور مجلسی' دیوانی اور فوجداری' عسکری اور تعزیری' معاشی اور معاشرتی غرضیکہ سب شعبوں کے احکامات موجود ہیں۔ مذہبی رسوم سے لے کر روزانہ کے امورِ حیات تک' روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک' جماعت کے حقوق سے لے کر فرد کے حقوق وفرائض تک' دُنیوی زندگی میں جزا وسزا سے لے کر عقبیٰ کی جزا وسزا تک ہر ایک قول وفعل اور حرکت پر قرآن پاک ہدایات کا مجموعہ ہے۔ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اُسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام ﷺ نے ہمارے لئے چھوڑا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں۔''

قیامِ پاکستان سے قبل ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر انہوں نے فرمایا:

''وہ پاکستان جس میں امیر زیادہ امیر اور غریب زیادہ غریب ہو جائیں قابلِ قبول نہیں ہو گا اور یہ کہ دیہاتوں کے اسّی فی صد عوام کی بھلائی اور بہتری کے لئے اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق نظام حکومت قائم کیا جائے گا۔''

اسی طرح مفکر پاکستان علامہ اقبال نے بھی اسلام کے اس کی تمدنی حیثیت سے زندہ رہنے کے لئے ایک آزاد اور خودمختار اسلامی ریاست کے قیام کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں ایک آزاد اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا۔ آپ نے فرمایا:

''میری آرزو ہے کہ پنجاب' صوبہ سرحد' سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک علیحدہ مملکت بنائی جائے۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہند میں ایک متحد اسلامی ریاست کا قیام اس علاقے کے مسلمانوں کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔ اس ملک میں اسلام تمدنی حیثیت سے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ مل جائے''۔

متذکرہ بالا تاریخی حقائق کے جائزہ اور قائداعظم اور علامہ اقبال کے اقتباسات

سے قیامِ پاکستان کی جدوجہد کا اصل مقصد از خود متعین ہو جاتا ہے کہ وطن عزیز کے حصول کا مقصدِ اوّلین صرف اسلام تھا۔ چنانچہ اب یہ کہنا کہ دوقومی نظریئے کا غلط نعرہ مولوی کی وجہ سے لگا ہے' سراسر زیادتی اور تاریخی حقائق سے اغماض اور روگردانی کے مترادف ہوگا۔ اس اعتبار سے ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان میں صحیح معنوں میں اسلام کا نظامِ خلافت قائم کیا جائے تاکہ شہیدانِ ملت کی قربانیاں بارآور ثابت ہوں اور بانیانِ پاکستان کے حسین خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکیں۔

نظامِ خلافت کا قیام ـــــ نوعِ انسانی کی ضرورت

بین الاقوامی سیاسی صورتِ حال کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک نیا عادلانہ اور منصفانہ نظام وقت کی اہم ضرورت ہے' کیونکہ مادّی تہذیب کے فرزند ناخلف اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے مابین طویل عرصے سے جاری سرد جنگ کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ کیونکہ نام نہاد مساوی اشتراکی نظام اپنے اصل مرکز سوویت یونین سے ناکام ہوکر رخصت ہوگیا۔ اس کے ساتھ سوویت یونین (U.S.S.R) کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔

دوسری جانب سرمایہ دارانہ نظام ہے جو اپنی موت آپ مرنے کو ہے' کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے بڑا علمبردار امریکہ مکمل تباہی اور بربادی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اقتصادی اور معاشی میدان میں وہ مسلسل پستیوں کی طرف رواں دواں ہے۔ صنعت اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں جاپان اور کوریا امریکہ بہادر کو مات دے گئے ہیں۔ چنانچہ جاپان عالمی منڈی میں امریکہ کی اشیاء کے مقابلے میں اپنی زیادہ معیاری مصنوعات نسبتاً کم داموں فروخت کر رہا ہے۔ جاپان کی یہ صنعتی ترقی اس لئے ممکن ہوئی ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکہ تو اپنی قوتیں اور خطیر رقم دفاع پر خرچ کرتا رہا جبکہ جاپانی قوم نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اور سعی و جہد صنعتی شعبے کے فروغ کے لئے وقف کر دی۔ الغرض امریکہ کی معاشی و اقتصادی اور صنعتی ترقی کا گراف مسلسل گر رہا ہے تا آنکہ آج وہ قرضوں کے بھاری بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔

اشتراکیت کی ناکامی کے بعد اگرچہ امریکہ پوری دنیا پر بالعموم اور اُمت مسلمہ پر بالخصوص اپنے نیو ورلڈ آرڈر (جو اصل میں جیو ورلڈ آرڈر ہے) کو مسلط کرنے کے نہ صرف ناپاک خواب دیکھ رہا ہے' بلکہ نئی صورت حال میں وہ اس پر عملاً کاربند بھی ہے جس کا بیّن ثبوت اقوامِ متحدہ جیسے عالمی ادارے پر اس کا تسلط ہے۔ چنانچہ اقوامِ عالم کا یہ ادارہ وائٹ ہاؤس کے اشاروں کے مطابق اپنی پالیسیاں مرتب کر رہا ہے۔ امریکہ بہادر جو چاہے اور جب چاہے سلامتی کونسل کے پلیٹ فارم سے کسی ملک پر اقتصادی و تجارتی پابندیاں عائد کر دے یا پھر فوج کشی کرے' جس کا عملی مظہر حال ہی میں افغانستان کے خلاف فوج کشی کرنا ہے۔ قبل ازیں امریکہ عراق کے خلاف فوج کشی کر چکا ہے' مگر سربیا کے معاملے میں امریکہ فوج کشی کے حق میں نہیں' حالانکہ بوسنیا میں ہزاروں مسلمان شہید کئے جا چکے ہیں اور لاکھوں کو ملک بدر کر دیا گیا ہے۔ سربیا کے وحشی درندے مسلمان عورتوں کی عصمت دری کرتے رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امریکہ کا یہ رویہ صریح اسلام دشمنی کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ اگرچہ امریکہ کے یہ استیصالی ہتھکنڈے اس کی طاقت کا مظہر ہیں مگر حقیقت میں یہ اس شعلے کی مانند ہے جو بجھنے سے پہلے زوردار طریقے سے بھڑک اٹھتا ہے۔ اس لئے کہ امریکہ کی صنعتی و اقتصادی بدحالی' قرضوں کا بوجھ' سفید اور سیاہ فام اقوام کے درمیان فسادات اور بعض دوسرے مسائل اس بات کے غماز ہیں کہ ع ''تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی'' کے مصداق بھیانک سرمایہ دارانہ نظام بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچنے والا ہے۔

معاشرتی میدان میں بھی مغرب نے عورت اور مَرد کے حقوق کے تعین میں افراط وتفریط کا مظاہرہ کیا جس کی بدولت نام نہاد مہذب مغربی معاشرہ شرفِ انسانیت سے گر کر حیوانوں کی صف میں آ کھڑا ہوا۔ عقلیت جدیدہ نے پہلے عورت کو شوہر کی ملکیت اور بے بس جانور قرار دے دیا اور پھر جب افراطی جذبہ پروان چڑھا تو تمدن کی بنیاد عورت کی کلی آزادی پر استوار کی گئی اور تمام امور میں مَرد اور عورت کو یکساں حقوق دیئے گئے' لہٰذا اب عورت جو چاہتی اور جب چاہتی کر گزرتی۔ وہ ہر مَرد سے ملاپ

رکھنے لگی۔ نتیجتاً رشتہ ازدواج کمزور ہوتا گیا' محبت والفت کا دیوالیہ ہوا اور تمدنی زندگی کا نظام درہم برہم ہوا۔ اس پر شہور لڈوسی نے ''Woman'' نامی کتاب لکھ کر یہ تجویز پیش کی کہ '' عورت کو دانایانِ مشرق کے قواعد کے تحت دوبارہ کنٹرول کیا جائے''۔ (۱) الغرض ان تصریحات سے واضح دکھائی دیتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا بُت بھی پاش پاش ہونے والا ہے۔

یہ دونوں نظام کیوں ناکام ہوئے! ان کی ناکامی کے علل واسباب کیا ہیں؟ ویسے تو اس کی بہت سی وجوہات ہیں مگر سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں نظام ہائے زندگی فطرتِ انسانی کے خلاف جنگ پر مبنی تھے اور دونوں انتہا پسندی کی جانب مائل تھے۔ مثلاً اشتراکی نظام میں تفریطی جذبے کی بدولت شخصی آزادی کو یکسر سلب کر کے اسے ایک معاشی حیوان بنا دیا گیا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں دولت چند ہاتھوں میں گردش کرتی رہتی جس کا سبب ظالمانہ سودی ہتھکنڈہ ہے۔ اسی ہتھکنڈے کے سبب سرمایہ دار نے سرمائے کو دولت کا ذریعہ بنا کر غریب مزدور کا استحصال کیا۔

الغرض آج انسانیت نے اشتراکیت کے پھندے کو گلے سے اتار پھینکا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کا بھی حالت نزع اور جان کنی کا وقت ہے۔ ایسے میں دنیا کے دانشور

---

(۱) اسی حقیقت کا برملا اظہار سابق سوویت یونین کے آخری صدر میخائیل گورباچوف نے اپنی کتاب ''پروسٹرائیکا'' میں کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ہماری مغرب کی سوسائٹی میں عورت کو گھر سے باہر نکالا گیا اور اس کو باہر نکالنے کے نتیجے میں بے شک ہم نے کچھ معاشی فوائد حاصل کئے اور پیداوار میں کچھ اضافہ ہوا ہے' اس لئے کہ مرد بھی کام کر رہے ہیں اور عورتیں بھی کام کر رہی ہیں' لیکن پیداوار کے زیادہ ہونے کے باوجود ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو گیا ہے۔ اور اس فیملی سسٹم کے تباہ ہونے کے نتیجے میں ہمیں جو نقصانات اٹھانا پڑے ہیں وہ ان فوائد سے زیادہ ہیں جو پروڈکشن کے اضافے کے نتیجے میں ہمیں حاصل ہوئے ہیں۔ لہٰذا میں اپنے ملک میں ''پروسٹرائیکا'' کے نام سے ایک تحریک شروع کر رہا ہوں۔ اس میں میرا ایک بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ عورت جو گھر سے باہر نکل چکی ہے' اس کو گھر میں واپس کیسے لایا جائے؟ اس کے طریقے سوچنے پڑیں گے' ورنہ جس طرح ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو چکا ہے اسی طرح ہماری پوری قوم بھی تباہ ہو جائے گی۔

وماہرین اور مفکرین ایک ایسے عادلانہ نظام کی تلاش میں ہیں جس میں نہ تو اشتراکیت کی طرح شخصی ملکیت کی نفی ہو اور نہ ہی سرمایہ دارانہ نظام کی طرح سرمایہ کو ذریعۂ سرمایہ بنایا گیا ہو۔ یقیناً ایسا عادلانہ نظام تو اسلام ہی کا نظام ہے۔ کیونکہ اسلام شخصی ملکیت اور آزادی کو بھی برقرار رکھتا ہے اور مضبوط اجتماعیت کی تشکیل پر بھی زور دیتا ہے۔ اسی طرح وہ سود کو حرام مطلق قرار دے کر سرمایہ ذریعۂ سرمایہ کے ظالمانہ معاشی نظریئے کا بھی ابطال کرتا ہے۔ اسلام دین اعتدال ہے' وہ انتہا پسندی کا بڑا مخالف ہے۔ وہ ہر معاملے میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے((خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا)) عورت اور مرد کے حقوق کی صحیح صحیح تعیین کرتا ہے۔ وہ عورت کو معزز' محترم اور قابلِ تعظیم گردانتا ہے' مگر اس کے ہاں مادر پدر آزادی کا کوئی تصور نہیں! اس کے علاوہ وہ زندگی کے تمام گوشوں میں عدل وقسط کا درس دیتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اسلام کے انہی زرّیں اصولوں پر مبنی ایک صالح اور پاکیزہ معاشرہ تشکیل دیا۔ دوست تو کیا دشمنوں نے بھی آپ ﷺ کے اس کارنامے کا گھٹنے ٹیک کر اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ ایچ جی ویلز (H.G.WELLS) اپنی ''مختصر تاریخ عالم'' میں رقم طراز ہے:

> ''انسانی حریت' مساوات اور اخوت کے نہایت اونچے وعظ اگرچہ مسیح ناصری (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کے یہاں بھی موجود ہیں' لیکن ان بنیادوں پر تاریخ میں پہلی بار ایک معاشرے کا قیام واقعتاً صرف محمد عربی (ﷺ وفداہ ابی وامی) کا کارنامہ ہے''۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آج نوعِ انسانی اسلام کے اسی عادلانہ اور منصفانہ نظام کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی بھی اسلامی ملک اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو منہج نبوی ﷺ پر از سرنو قائم کرے' اور دنیا پر یہ حقیقت آشکار کر دے کہ وہ آج جس عادلانہ نظام کی تلاش میں ہے وہ اسلام کا نظام ہے جس میں انسانیت کے غموں کا مداوا ہے۔ وہی جو اقبال نے فرمایا تھا۔

مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تُو بھی ہو!
وہ چمک اٹھا افق ' گرمِ تقاضا تُو بھی ہو!

حکمتِ دعوت

قرآنی رہنمائی واُسوۂ رسولؐ

فرحت عزیز

لفظ حکمت کا مادہ ''ح' ک' م'' ہے' جس کے معانی جاننے' سمجھنے اور عدل کے مطابق فیصلہ کرنے کے ہیں۔یعنی اشیاء کی معرفت اور علوم کی فضیلت کو پہچاننا۔(۱) یہ لفظ ''الرائد'' اور ''المورد'' میں حکم کے معنی میں استعمال ہوا ہے' یعنی ''دعاء الی الحکمۃ'' (۲) اور ''اردو دائرۂ معارف'' میں اس لفظ پر طویل بحث کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ حکمت وہ کلامِ نافع ہے جو جہالت اور سفاہت سے روکتا ہے۔ یہ لفظ بمعنی مواعظ اور امثال کے بھی آتا ہے۔اس سے مراد عظیم اثاثہ بھی ہے۔(۳) ''مفردات القرآن'' میں حکمت کی تشریح کرتے ہوئے متعدد مفہوم بیان کئے گئے ہیں' یعنی علم و عقل کے ذریعے حق بات دریافت کرنا اور حکمتِ الٰہی کے معنی اشیاء کی معرفت اور حقیقت کا علم ہے' جبکہ انسانی حکمت سے مراد موجودات کی معرفت اور اچھے کاموں کو انجام دینا ہے۔حکمت اس آگاہی کو بھی کہتے ہیں جو اُمم سابقہ کے تجربات سے بطورِ تجربہ حاصل ہو۔ یہ لفظ حکم سے عام ہے۔ ہر حکمت حکم ہوسکتی ہے لیکن ہر حکم حکمت نہیں ہو سکتا۔قرآنی آیات میں حکمت سے مراد تفسیر قرآن ہے۔اس سے مراد سنّت رسولؐ بھی لیا جاتا ہے جبکہ امام حمید الدین فراہیؒ نے حکمت کی تعبیر اس قوّت سے کی ہے جس کے باعث فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس قوت کے اثرات کلام کی حقانیت' اخلاق کی پاکیزگی اور حسن اخلاق کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔(۴)

دعوت کے لغوی معنی حق بات یعنی کلمۂ شہادت کی ترویج کرنا ہے۔(۵) اور ''الرائد'' و ''المورد'' میں دعوت کے معنی اللہ کے دین کی طرف بلانے کے ہیں۔(۶)

جبکہ امام راغب کے نزدیک دعوت کے معنی ندا کے ہیں۔ سیّد قطب شہید دعوت سے مراد لوگوں کو معرفت ربّ کا درس دینا بیان کرتے ہیں' تاکہ انہیں ہر چوکھٹ سے ہٹا کر ایک ہی معبود وحدہ لاشریک کے سامنے جھکا دیا جائے۔(۷) اور مذہبی مفہوم میں "دعوت" وہ پیغام ہے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے توسط سے انسانوں کو دیا ہے۔ یعنی دین حق (اسلام) کو سچا مانو۔ اور حضرت محمد ﷺ کی بعثت کا مقصد اسی دعوت کی تجدید تھی جو از ابتداء انبیاء کرام دیتے چلے آئے۔ اور یہی دعوۃ الاسلام یا دعوۃ الرسول ہے۔(۸)

انبیائے کرام کی دعوت اصولی و نظریاتی دعوت ہے۔ پیغمبروں کا کام لوگوں کو توحید الٰہی کی طرف بلانا اور تقویٰ کی راہ پر چلانا ہے۔ ہدایت ربانی کا وعدہ دراصل نسل آدمؑ کے لئے نبوت و رسالت کا جاری رہنے والا پہلا وعدہ ہے۔(۹) ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں نے اپنے اپنے طور پر دین الٰہی کی اشاعت کی جن میں سے تین سو پندرہ صاحب کتاب تھے۔(۱۰) ان سب کے بارے میں معلومات کتب حدیث' رجال' سیرت و تاریخ میں بکثرت موجود ہیں۔

جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو راہِ حق کی طرف بلایا مگر ان کی قوم نے اپنی دولت و حشمت کی وجہ سے آپؑ کی بات نہ مانی' انہوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ جس کو نہ ہم پر دولت و ثروت میں برتری حاصل ہے اور نہ وہ انسانیت کے رتبہ سے بلند فرشتہ "ہیکل" ہے' اس کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ ہمارا پیشوا بنے۔ اس کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ کے ہاں دولت و حشمت کی بجائے اخلاص کی قدر ہے۔ اس کی سعادت کا حصول و ادراک سرمایہ کی رونق نہیں ہے' بلکہ طمانیت قلب' رضائے الٰہی' غناءِ قلب اور اخلاص نیت و عمل ہے۔(۱۱) اسی طرح حضرت ادریس علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کا پیغام دیا تو سوائے چند افراد کے کسی نے آپ کی باتوں پر کان نہ دھرے۔ اس کے باوجود آپؑ ادائے فرض سے نہ ہٹے بلکہ نہایت مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے دین کی تبلیغ کی۔(۱۲) حضرت ہود علیہ السلام

نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو مل جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا' مؤمنوں نے نجات پائی اور سرکش قوم ہلاک ہوئی۔ (۱۳) عاد و ثمود کے حوالے سے یہ بات خصوصیت سے بیان کی گئی ہے کہ مادی خوشحالی اور خوش بختی نے انہیں خدا کی یاد سے غافل کر دیا۔ اسی طرح حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے مختلف معجزات کو نظر انداز کر دیا۔ اور جو کوئی قوم دنیوی کامرانیوں اور خوشیوں کو اپنا شعار بنا لے تو پھر ربّ تعالیٰ کی گرفت میں آ جاتی ہے۔ (۱۴) جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ﴾ (البروج:۱۲)

''یقیناً تیرے ربّ کی گرفت بہت سخت ہے''۔

حضرت لوط علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتے تھے:

﴿رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَی الْقَوْمِ الْمُفْسِدِیْنَ﴾ (العنکبوت:۳۰)

''میرے مالک! میری مدد فرما اِن فسادی لوگوں کے مقابلہ میں''۔ (۱۵)

انبیائے کرام کو اللہ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوئیں ان میں سے ایک خاص نعمتِ حکمت کا ذکر قرآن میں بار بار ملتا ہے۔ جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کی شان میں آتا ہے کہ:

﴿وَشَدَدْنَا مُلْکَهٗ وَاٰتَیْنٰهُ الْحِکْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾ (ص:۲۰)

''ہم نے اس کی سلطنت کو زبردست کیا اور ہم نے اس کو حکمت اور فیصل خطاب عطا فرمایا''۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ نے منصب نبوت عطا فرمایا تھا۔ دینِ حق کی تبلیغ ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ جیل کے ماحول میں بھی آپؑ برابر تبلیغ میں سرگرم رہتے۔ قرآن نے آپؑ کے وعظ کا اس طرح ذکر کیا ہے: (۱۶)

﴿یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِکَ الدِّیْنُ

الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (یوسف:۳۹،۴۰)

''اے قید خانے کے ساتھیو! کیا متفرق معبود بہتر ہیں یا اللہ اکیلا غالب بہتر ہے؟ تم اُس کو چھوڑ کر صرف بے حقیقت ناموں کی عبادت کرتے ہو' جن سے تم اور تمہارے آباء و اجداد پکارتے ہیں جبکہ اللہ نے اس کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ بے شک اللہ کے حکم کے علاوہ کسی کا حکم نہیں ہے۔ اس نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی دین ہمیشہ رہنے والا ہے' لیکن بہت سے لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے''۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوتِ توحید کے ساتھ ساتھ ناپ تول میں کمی کرنے پر بھی تنبیہ فرمائی:(۱۷)

﴿قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۖ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ﴾ (ھود:۸۴)

''فرمایا: اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ناپ اور تول میں کمی نہ کیا کرو۔ میں تم کو آسودہ حال دیکھ رہا ہوں اور مجھے تم پر گھیر لینے والے عذاب کا خوف ہے''۔

جبکہ دنیوی اعتبار سے معمولی حیثیت کے لوگوں کے علاوہ ساری قوم بے اثر ثابت ہوئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ قرآن میں یوں بیان ہوا:(۱۸)

﴿اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا﴾ (مریم:۴۲)

''(یاد کرو) جب انہوں نے اپنے باپ سے فرمایا: ابا جان! آپ ان معبودوں کی عبادت کیوں کرتے ہیں جو نہ سن سکتے ہیں' نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ آپ کو کسی قسم کا نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں''۔

قرآن میں ان کے والد کے سخت الفاظ میں جواب کا ذکر بھی موجود ہے کہ:

﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا﴾ (مریم:۴۶)

''(اے ابراہیمؑ!) اگر تُو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا' اور تو مجھ سے دور ہو جا!''

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک پیغمبر حق تھے۔ توحید الٰہی، ردّ شرک و اصنام پرستی، تزکیۂ نفس و اخلاق، درس کتاب و حکمت ان کے فرائض نبوت کے حقیقی ارکان تھے۔ حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون (علیہما السلام) کو فرعون کی طرف دعوت کا ایک بہترین اصول بتا کر رخصت کیا گیا:(۱۹)

﴿اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۞ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى۞﴾ (طٰہٰ: ۴۳، ۴۴)

''آپ دونوں فرعون کے پاس جائیں، یقیناً وہ سرکش ہے۔ اس سے نرم لہجے میں گفتگو کرنا تاکہ وہ نصیحت حاصل کرے اور خدا خوفی کی روش اختیار کرے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام شروع ہی سے پاک باز انسان تھے۔ ان کی حکمت و ذہانت کا یہ عالم تھا کہ چودہ برس کی عمر میں ہی ان کا شمار یروشلم کے بڑے بڑے عالموں میں ہونے لگا۔ انہوں نے انتہائی حکمت سے دعوت حق کی تبلیغ کی (۲۰) جس کا ذکر سورۃ المائدۃ کی آخری آیات میں ملتا ہے۔ الغرض تمام پیغمبروں نے دعوتِ الٰہی کی تبلیغ کے دوران حکمت کے اصول کو پیش نظر رکھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کے ظہور کی دعا مانگی جس کا ذکر سورۃ البقرۃ میں یوں آتا ہے:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۞﴾ (البقرۃ: ۱۲۹)

''اے ہمارے ربّ! ان میں ایک رسول بھیج جو ان ہی میں سے ہو، وہ انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تو زبردست، حکمت والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کرتے ہوئے فرمایا کہ:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۞﴾ (البقرۃ: ۱۵۱)

''جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان ایک رسول بھیجا جو تم ہی میں سے ہے، جو تمہیں تمہاری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی

تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ کچھ سکھاتا ہے جسے تم اس سے پہلے نہیں جانتے تھے''۔

اس دعائے ابراہیمی کی قبولیت کو اللہ رب العزت نے سورۂ آلِ عمران میں اپنا احسان قرار دیا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (آل عمران:۱۶۴)

''اللہ تعالیٰ نے مؤمنون پر بہت بڑا احسان کیا ہے ان میں ایک رسول بھیج کر جو ان ہی میں سے ہے' وہ ان پر اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور وہ اس سے پہلے واضح گمراہی میں تھے''۔

اور فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الجمعة:۲)

''(اللہ) وہی ہے جس نے امیین (ان پڑھ لوگوں) میں ایک رسول بھیجا جو ان ہی میں سے ہے۔ وہ ان پر اس کی آیات کی تلاوت فرماتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے' حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے''۔

اللہ تعالیٰ نے خود آنحضور ﷺ کو مخاطب کر کے اپنا یہ احسان بھی ظاہر فرمایا۔ جیسا کہ آیت قرآنی ہے کہ:

﴿وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ (النساء:۱۱۳)

''اگر آپؐ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو لوگوں کے ایک گروہ نے تو آپؐ کو غلطی میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا تھا' لیکن غلطی میں نہ ڈال سکتے تھے مگر

اپنے آپ کو اور وہ آپ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اور اللہ نے آپؐ پر کتاب اور حکمت کی باتیں نازل فرمائیں اور آپ کو وہ کچھ سکھایا جو آپؐ نہ جانتے تھے۔ بے شک آپؐ پر اللہ کا بڑا فضل ہے''۔

آنحضور ﷺ کو اس طرح بھی مخاطب کیا گیا کہ:

﴿ذٰلِکَ مِمَّا اَوْحٰی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَةِ﴾ (الاسراء:۳۹)

''یہ آپ پر آپ کے ربّ کی طرف سے وحی کیا گیا ہے از قسم حکمت''۔

اور یہ بھی کہ:

﴿وَاذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ وَمَا اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنَ الْکِتٰبِ وَالْحِکْمَةِ یَعِظُکُمْ بِهٖ﴾ (البقرة:۲۳۱)

''اور اپنے اوپر اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور جو تم پر کتاب اور حکمت سے نازل کیا گیا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو''۔

ازواجِ مطہرات کو خاص طور پر یوں مخاطب کیا گیا کہ:

﴿وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ وَالْحِکْمَةِ﴾

(الاحزاب:۳۴)

''اور (نبیؐ کی بیویو!) اللہ کی آیات اور حکمت کو یاد کرو جو تمہارے گھروں میں تلاوت کیا جاتا ہے''۔

آپؐ کو تبلیغ و دعوت کا حکم بھی اسی طرح ہوتا ہے کہ:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ (النحل:۱۲۵)

''اللہ کے راستے کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ سے بلاؤ اور لوگوں سے بہترین انداز میں مجادلہ کرو''۔

﴿وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِّنَ الْاَنْبَاءِ مَا فِیْهِ مُزْدَجَرٌ ۝ حِکْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝﴾ (القمر:۴،۵)

''البتہ ان لوگوں کے پاس تو (امم سابقہ) کی خبریں پہنچ چکی ہیں، تاکہ ان کو عبرت اور اعلیٰ درجے کی حکمت حاصل ہو، مگر انہیں خوف دلانے والی چیزیں فائدہ نہیں دیتیں''۔

ان تمام آیات قرآنی کا مقصود حضور ﷺ کو دعوت حق میں حکمت کی تلقین کرنا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے تبلیغ کا کام جس حکمت و دانشوری سے سرانجام دیا وہ تاریخ دعوت و عزیمت کا درخشاں باب ہے[۲۱]۔ احادیث سے حکمت کی اہمیت اس طرح واضح ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

''صرف دو آدمی قابل رشک ہیں۔ ایک وہ آدمی جس کو اللہ نے مال دیا ہے اور وہ اسے حق کی راہ میں خرچ کرتا ہے اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ نے حکمت دی ہے اور وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے''۔ (۲۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے''۔

رسول کریم ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں دعا کرتے ہوئے فرمایا کہ ''اے اللہ! اسے حکمت عطا فرما''۔ (۲۳)

آنجناب علیہ السلام کسی ایسے امر کی تبلیغ نہ فرماتے جس پر آپؐ نے خود عمل کر کے نہ دکھایا ہو۔ آپ ﷺ قرآن کے اس فرمان کی اکثر تلقین کرتے کہ:

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (الصف: ۲)

''اے ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے''۔

آپؐ کا طریقہ دعوت و تبلیغ اتنا پُر اثر تھا جو زبان سے گزر کر دلوں میں جگہ پکڑ لیتا تھا۔ آپؐ کی زبان مبارک نہایت فصیح و بلیغ تھی۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ ((اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ))(۲۴) یعنی ''میں عرب کا سب سے فصیح انسان ہوں''۔ آپؐ نے سحر انگیز بیان کی تلقین کی[۲۵] جو سننے والے پر بالکل واضح ہو۔ آپؐ ہمیشہ لوگوں سے اچھے اخلاق کی تلقین کرتے رہتے۔ آپؐ دوران تبلیغ لوگوں کی آسانی کو پیش نظر رکھتے۔ آپؐ بالعموم اپنی بات تین بار دہرایا کرتے تھے تاکہ مخاطبین پر بات پوری طرح واضح ہو جائے۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ:

((یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا))(۲۶)

''آسانی پیدا کرو اور دشواری پیدا نہ کرو۔ اور لوگوں کو خوش خبری دو اور متنفر مت کرو''۔

حضور ﷺ کی اس صفت کا ذکر قرآن میں یوں ہوتا ہے:

﴿فبما رحمة من الله لنت لهم ۚ ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك ۖ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

''آپؐ اللہ کی رحمت کی وجہ سے ان (اہل ایمان) کے لئے رحم دل ہیں۔ اگر آپؐ تند خو اور سخت طبیعت ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے''۔ (۲۷)

آپؐ کو اہل کتاب کے بارے میں بہترین مجادلہ کا حکم دیا گیا۔ آپؐ جس کے دل میں خدا کا خوف محسوس کرتے اس کی اصلاح و ہدایت کی زیادہ کوشش کرتے۔ (۲۸)

حضور ﷺ کے اس طرز عمل کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿فذكر ۖ انما انت مذكر﴾ (الغاشیة:۲۱)

''پس نصیحت کیجئے! آپ تو بس نصیحت کرنے والے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ حقیقت بھی ظاہر کی کہ

﴿لا اكراه في الدين ۚ﴾ (البقرة:۲۵۶)

''بے شک دین میں کوئی جبر نہیں''۔

آپؐ کے پیش کردہ کلام ربانی میں اتنی زبردست تاثیر تھی کہ جو لوگ اسے تسلیم کر لیتے وہ اس کے لئے جان و مال کی بازی لگا دیتے اور جو تسلیم نہیں کرتے تھے ان کے دل بھی مرعوب ہو جاتے۔ عتبہ جب قریش کا نمائندہ بن کر آنحضور ﷺ کے پاس حاضر ہوا تو اپنی تجاویز کے جواب میں سورۂ فصلت کی ابتدائی آیات سنیں۔ جب وہ واپس گیا تو اس کے ساتھیوں نے کہا کہ خدا کی قسم عتبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے اور یہ وہ صورت نہیں ہے جسے وہ لے کر گیا تھا۔ (۲۹)

بہرطور یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ دعوت و تبلیغ اہل ایمان کی ضروری صفت ہے۔ تمام انبیاء و رُسل کو اس دعوت کا مکلف کیا گیا ہے اور موجودہ دور میں یہ ذمہ داری علماء کرام پر عائد ہوتی ہے (۳۰)۔ ویسے بھی اسلام ایک تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریئے پر انسانی زندگی کی پوری عمارت کی تعمیر کرنا چاہتی

ہے اور اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم اصول یہ ہے کہ ہر مسلمان پر بھی اپنی بساط کے مطابق دعوت حق کے فرائض پورے کرنا ضروری ہیں (۳۱)۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری کے نزدیک بے شک ایمان لانا اور اس پر ثابت قدم رہنا بہت بڑی بات ہے۔ لیکن اس سے اونچا ایک اور مقام ہے جس پر آشیانہ بند ہونے کے لئے کوشاں رہنا ہر بندۂ مؤمن پر لازم ہے۔ اور وہ یہ کہ لوگوں کو بھی خداوند قدوس کی وحدانیت و کبریائی پر ایمان لانے کی دعوت دے (۳۲)۔ اور جو لوگ اللہ کے ہاں بلند مرتبہ اور اعلیٰ صفات کے حامل ہیں وہی اس اصول پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں ورنہ یہ ہر ایک کا کام نہیں ہے (۳۳)۔ اور جو لوگ اس کام کے حق کو ادا کرتے ہیں بے شک انہوں نے اپنے تئیں نفع پہنچایا۔ اور خلق اللہ کو بھی اپنی ذات سے نفع پہنچایا اور بدی کے مقابلے میں بھلائی اختیار کرنے کی خصلت بھی صرف انہی کو ملتی ہے جو نفسیاتی خواہشات کی مخالفت پر تلے رہتے ہیں۔ اور سب سے خوش نصیب وہ ہے جس کو تجلیات ذاتی و صفاتی کا بڑا حصہ ملتا ہے۔ نفس پر اعلیٰ صفات جلوہ پاش ہو جاتی ہیں تو بری صفات نکل جاتی ہیں (۳۴)۔ جس زمانہ میں لوگ حق سے جتنے زیادہ بیگانہ ہوں' دہریت اور مادیت کی جتنی زیادہ گرم بازاری ہو' طاغوت کی حکمرانی جتنی زیادہ وسیع' ہمہ گیر اور پائیدار ہو حق کے علمبرداروں پر دین کی اقامت کا فریضہ اتنا ہی زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ اور اس میں حکمت بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ (۳۵) دعوت حق کے وقت خاص طور پر اسی چیز کا دھیان رہے کہ بات کو حتی الامکان اس دانائی اور عمدگی سے کہا جائے کہ سننے والا زیادہ سے زیادہ متاثر ہو (۳۶)۔ حکمت سے مراد خاص طور پر یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت' استعداد اور حالات کو سمجھ کر نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے اور مباحثہ معقول دلائل کے ساتھ مہذب زبان میں اور افہام و تفہیم کے جذبے سے ہونا چاہئے تاکہ جس شخص سے بحث کی جا رہی ہو اس کے خیالات کی اصلاح ہو سکے (۳۷)۔

حوالہ جات

۱) ابن منظور' ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم الافریقی' لسان العرب' الجزء الثالث' ص ۲۷۰' ناشر دار احیاء التراث العربی' بیروت' الطبعة الاولیٰ' ۱۹۹۵ء۔ وفراهی' حمیدالدین' حکمت قرآن' مترجم خالد مسعود' ص ۱۴' فاران فاؤنڈیشن' اردو بازار لاہور ۱۹۹۵ء۔

۲) جبران مسعود' الرائد' ج۱' ص ۵۴۳' دار العلم للملائیین بیروت' الطبعة الثانیة ۱۹۹۰ء۔ وروحی البعلبکی' الدکتور' المورد' ص ۵۸۳' دار العلم للملائیین' الطبعة الثالثة' ۱۹۹۱ء۔

۳) دانش گاہ پنجاب لاہور' اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ج۵' ص ۴۶۸ تا ۴۶۹' ۱۹۷۳ء۔

۴) راغب اصفہانی' امام مفردات القرآن فی الفاظ القرآن' ج۱' ص ۳۴۲ ۔ اهل حدیث اکادمی کشمیری بازار لاہور' ۱۹۶۷ء و فراهی ۴۳۲ حکمت قرآن' ص ۱۴

۵) ابن منظور' لسان العرب' ج۳' ص ۳۶۰۔

۶) روحی البعلبکی' المورد' ص ۵۴۳۔ و جبران مسعود' الرائد' ج۱' ص ۴۷۰۔

۷) راغب' مفردات' ج۱' ص ۳۴۲۔

۸) دانش گاہ پنجاب لاہور' اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ص ۳۴۵۔

۹) خالد علوی' پیغمبرانہ منہاج دعوت' ص ۲۱' احباب پبلشرز لاہور' طبع اوّل ۱۹۹۹ء

۱۰) احمد بن حنبل' مسند الامام احمد بن حنبل' ج۶' ص ۶۰۰ (مسند حضرت ابو ذر غفاری) مکتبہ دار الباز عباس احمد الباز مکة المکرمہ' الطبعة الثانیة ۱۴۱۴ھ' ۱۹۹۳ء

۱۱) سیوهاروی' حفظ الرحمٰن' محمد' قصص القرآن' ج۱' ص ۶۶ تا ۶۷' دار الاشاعت کراچی۔ بدون تاریخ۔

۱۲) ادارہ تصنیف و تالیف' انوار الانبیاء' ص ۱۴' شیخ غلام علی اینڈ سنز پرنٹرز' کراچی' طبع اول ۱۹۵۹ء۔

۱۳) آزاد' ابوالکلام' مولانا' انبیائے کرام' مرتبہ: مولانا غلام رسول مہر' ص ۴۸۔ اسلامک پبلیکیشنز لاہور۔ بدون تاریخ۔

۱۴) خالد علوی' پیغمبرانہ منہاج دعوت' ص ۱۳۶۔

۱۵) انوار الانبیاء' ص ۴۲

۱۶) سیوهاروی' قصص القرآن' ج۱' ص ۳۰۱ تا ۳۰۲

۱۷) خالد علوی' پیغمبرانہ منہاج دعوت' ص ۲۵۶

۱۸) منصور پوری' قاضی محمد سلیمان' رحمة للعالمین' ج۲' ص ۲۳۸' الفیصل ناشران و تاجران لاہور ۱۹۹۱ء

۱۹) آزاد' انبیائے کرام' ص ۲۶۶

۲۰) عبدالحمید' آخری نبیؐ اور ان کی تعلیمات' ص ۴۰۶ تا ۴۰۷' فضل سنز کراچی ۱۹۹۸ء

(باقی صفحہ ۱۲۰ پر)

اسلامی احیاء کی تحریکوں کی ناکامی کے اسباب

مولانا سیّد وصی مظہر ندوی

چند اصولی باتیں

اسلام کا نظامِ حیات اپنی کامل اور مثالی صورت میں تو صرف خلافت راشدہ کے دَور میں قائم رہا۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے مختصر دور میں پھر خلافت راشدہ کی جھلک نظر آئی۔ اس کے علاوہ بعض مخصوص علاقوں میں کچھ مدت کے لئے اسلامی نظام قائم ہوا' مثلاً مغربی افریقہ میں موحدین کی حکومت یا سرحد اور افغانستان کے بعض علاقوں میں سیّد احمد شہیدؒ کی خلافت یا دورِ حاضر میں ''طالبان'' کا مختصر دورِ حکومت۔

ان مثالوں سے تمام انسانوں پر بالعموم اور مسلمانوں پر بالخصوص اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حجت قائم کرنا مقصود ہے کہ اسلام کوئی خیالی یا ناقابل عمل نظام نہیں جس کو انسان اختیار ہی نہ کر سکے۔ دوسرے یہ کہ اسلام جب بھی قائم ہوا اور جہاں بھی قائم ہوا وہاں وہ ہمیشہ نزولِ برکات کا وسیلہ' امن و امان کی ضمانت اور قیامِ عدل وقسط کا ذریعہ ثابت ہوا۔

تاہم جس طرح صحت کاملہ کا حصول ممکن تو ہے مگر کامل حالت میں اس کی بقاء کا عرصہ بالعموم بہت کم ہوتا ہے' لیکن صحت کاملہ کی عمر مختصر ہونے کے باوجود ہر انسان اس کے حصول کی تمنا اور جدوجہد کرتا رہتا ہے' اسی طرح اسلام کے کامل نظامِ زندگی کی بقاء کی مدت زیادہ تو نہیں تاہم اس کو برپا کرنے کے لئے تاریخ میں ہمیشہ وہ لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے اپنے ''شرارِ آرزو'' سے بے شمار دلوں کو گرمایا اور روشن کیا اور اس مقصد کے حصول کے لئے جان و مال کی ہر بازی کھیل جانے والے بے شمار سرفروشوں اور مجاہدوں کو سرگرمِ عمل رکھا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

انسان کی فطرت اللہ تعالیٰ نے کچھ اس طرح بنائی ہے کہ وہ اگر کسی چیز کی حقانیت پر یقین کر لیتا ہے یا اگر کسی نظام کو نوعِ انسانی کی مجموعی بھلائی یا مظلوموں کی مدد اور ظالموں کی بربادی کے لئے ضروری سمجھ لیتا ہے تو وہ اس بحث میں پڑے بغیر کہ اس نظام کا قیام ممکن بھی ہے یا نہیں' اور آیا وہ خود اس کے حصول کے وسائل رکھتا بھی ہے یا نہیں' وہ اس نظام کو برپا کرنے کے لئے ہر بازی کھیلنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

دُور کیوں جایئے فرانس میں شہنشاہیت کے خاتمے اور جمہور کی حکمرانی قائم کرنے کے لئے جمہوریت کے علمبرداروں اور عوام نے بے مثال قربانیاں دیں' حالانکہ عوام کی مکمل حکمرانی کا نظام نہ تاریخ میں پہلے کبھی ایک دن کے لئے قائم ہوا اور نہ آج تک قائم ہو سکا ہے' بلکہ ساری دنیا میں اِس وقت بھی ہر جگہ عوام کے نام پر سرمایہ دار اور مفاد پرست طبقے دادِ حکمرانی دے رہے ہیں۔

اسی طرح اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے لئے اس نظریہ کے علمبرداروں نے زبردست جدوجہد کی اور جان و مال کی ہر قربانی دی' حالانکہ وہ غیر طبقاتی معاشرہ جس کی خوشخبری کارل مارکس نے دی تھی' نہ پہلے کبھی دنیا میں وجود میں آیا اور نہ کمیونسٹ انقلاب پر تقریباً سو سال گزر جانے کے بعد کہیں قائم ہوا' بلکہ عوام زار کی شہنشاہیت سے نکل کر انتہائی بے رحم آمریت کے پنجے میں گرفتار ہو گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوریت کے قیام اور شہنشاہیت کے خاتمے کی جدوجہد' اسی طرح اشتراکی انقلاب اور سرمایہ داری کے خاتمے کی تحریک سے بحیثیت مجموعی نوعِ انسانی کو بہت سے فوائد بھی حاصل ہوئے' ترقی کی راہیں کھلیں' سرمایہ داری کو خود اپنے اندر انقلاب لانا پڑا اور روشن خیال سرمایہ داری کے ذریعے اس نے انسانی معاشرے کے لئے خود کو قابلِ برداشت بنانے کی کوشش کی۔

یہی انسانی مجموعی مفاد ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ انسانوں میں کچھ لوگوں کو بطور

آلۂ کار استعمال کرتا ہے' پھر وہ کسی پسندیدہ نظام کے حصول کے لئے اس طرح سرگرم عمل ہو جاتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے الفاظ میں: **فاتون عن انفسهم باقون بما القی الیهم من فوقهم** ''یعنی وہ اپنی جانوں سے بے نیاز ہو کر اس کام کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں جس کا اشارہ ان کو اوپر سے ملتا ہے۔

انسانی فطرت اور تاریخ کا یہی وہ سبق ہے جس کا ذکر قرآن حکیم نے کئی مقامات پر کیا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (البقرہ: ۲۵۱)

''اگر اللہ تعالیٰ کچھ انسانوں کو دوسرے انسانوں کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین فساد سے بھر جاتی' لیکن اللہ تو اہلِ عالم پر بہت فضل کرنے والا ہے۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو عناصر' نباتات اور حیوانات تخلیق فرمائے ہیں ان سب میں کچھ خواص ودیعت کئے ہیں۔ اگر ان عناصر سے یہ خواص ظاہر ہوتے ہیں تو یہ عین تخلیق الٰہی کا تقاضا ہے۔ ان خواص واثرات کا ظہور بجائے خود خیر ہے۔ مثلاً آگ اگر جلاتی ہے' تلوار اگر کاٹتی ہے' اسی طرح سمندروں سے بھاپ اٹھنا' ان سے بادل بننا' ان بادلوں کا ہواؤں کے دوش پر اڑتے ہوئے کسی علاقے میں جا کر پانی برسانا' یہ سب کام خیر ہیں اور دنیا کا نظام اسی طرح چل رہا ہے۔

تاہم اگر آگ سے کسی غریب کا گھر جل جاتا ہے' تلوار سے اگر کسی مظلوم کی گردن کٹ جاتی ہے' بارش سے اگر کمہار کے برتن پانی میں بہہ جاتے ہیں' تو ان اثرات کے ظاہر ہونے سے کچھ لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے' ان کو ان اثرات کا ظہور برا لگتا ہے' ان کو اللہ تعالیٰ سے شکوہ ہوتا ہے کہ وہ قادر و عادل ہے' پھر اس نے ان کے ساتھ یہ معاملہ کیوں ہونے دیا' مگر اللہ کی حکمت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ وہ اسباب کے نتائج کو ظہور میں آنے سے نہ روکے' کیونکہ اگر اخلاقی تقاضوں کے تحت اسباب کے اثرات بالعموم باطل ہوتے رہیں تو اسباب پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے گا اور نظامِ عالم درہم برہم ہو کر رہے گا۔

خالص اسلام کی علمبردار ہیں' جو اسلام کے لئے جان و مال کی ہر بازی کھیل جاتے ہیں' جنہوں نے جاں بازی اور جاں سپاری کے شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں' وہ بھی ناکامی کا مُنہ دیکھتے ہیں' اللہ کی نصرت سے وہ بھی محروم ہیں۔ سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین' شیخ حسن البناء کی الاخوان المسلمون' مولٰینا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت اسلامی اور اس سے پھوٹنے والی دیگر تنظیمیں' نیز ترکی کی اسلامی تحریکیں سب کی سب کیوں ناکام ہیں؟

ان ساری الجھنوں کا جواب ان اصولی باتوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے جو آغاز میں بیان کی گئی ہیں۔ تاہم اللہ بھلا کرے جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب امیر تنظیم اسلامی کا کہ انہوں نے گزشتہ جمعہ کو مسجد دارالسلام میں ہفتہ وار خطاب میں اپنی روایات کے مطابق اس اہم سوال پر بحث کی ہے کہ احیائی اسلامی تحریکیں گزشتہ پون صدی سے کیوں ناکام ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے خاص طور پر تین اسباب کا تذکرہ کیا ہے۔

ان میں سے پہلا سبب انہوں نے عجلت پسندی کو قرار دیا ہے۔ بلاشبہ عجلت پسندی اور اسلام کو جلد از جلد غالب کرنے کی نیک خواہش نے اکثر اسلامی تحریکوں کو غلط راہوں پر ڈال دیا ہے۔ چنانچہ ان تحریکوں نے اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کو پس پشت ڈالا ہے جو مکّی دَور کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ اور آپ کے اصحابؓ کو دی تھی کہ بس اسی پروگرام تک محدود رہو جو تم کو دیا گیا ہے اور مقررہ حدود کے باہر نہ جاؤ۔ سورۂ ہود کے آخر میں ارشاد ہے:

﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ ۝ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِنَ اللَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ۚ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّاكِرِينَ ۝ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝﴾ (ھود: ۱۱۲-۱۱۵)

''پس (اے نبیؐ!) تم' اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و

طاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں' ثابت قدمی سے اسی پر جمے رہو جس طرح تم کو حکم دیا گیا ہے' اور حد سے تجاوز نہ کرو' یقیناً جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے۔ اور مشرکوں کی طرف نہ جھکو' ورنہ تم کو (جہنم کی) آگ آ لے گی۔ اللہ کو چھوڑ کر تمہارے کوئی سرپرست تو ہیں نہیں' پھر تمہاری مدد نہ کی جائے گی۔ اور نماز قائم کرو دن کے دونوں کناروں پر اور کچھ حصہ رات میں۔ یقیناً اچھائیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ یہ یاد دہانی ہے ان کے لئے جو یاد دہانی کے طالب ہیں۔ اور صبر کرو (جمے رہو) کیونکہ اللہ خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔''

چنانچہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی یہ تشخیص سو فی صد درست ہے کہ بہت سی اسلامی تحریکوں نے عجلت پسندی یا جلد نتائج حاصل کرنے کے جذبے کے تحت اپنی تحریکوں کو اسلامی اصول و تعلیمات کے مطابق چلانے کے بجائے انہوں نے غیر اسلامی تحریکوں کے انداز اور طریقے اختیار کر لئے۔

تاہم ناکامی کا جو دوسرا سبب ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا ہے کہ اسلامی تحریکوں نے اپنے متوسلین میں ایمانی بنیادوں کو مستحکم کرنے کی وہ کوشش نہیں کی جس کے بغیر کوئی اسلامی تحریک حقیقتاً اسلامی تحریک کہلانے کی حق دار نہیں ہو سکتی' تو یہ بات جماعتِ اسلامی کے بارے میں تو خاصی حد تک درست معلوم ہوتی ہے' جس کی ساری اٹھان سیاسی بنیادوں پر ہوئی اور جس نے اسلام کو ایک بہتر نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کر کے ہی اپنے کارکنوں کو اس کو برپا کرنے کی جدوجہد پر آمادہ کیا تھا' لیکن الاخوان المسلمون اور القاعدہ یا طالبان کی طرف سے جس مستحکم ایمان کی مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں ان کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ ان تحریکوں نے ایمان کی آبیاری کا کام اچھی طرح کیا تھا۔

اسی طرح اسلامی تحریکوں کی ناکامی کا تیسرا سبب جو ڈاکٹر صاحب نے بیان فرمایا کہ ان تحریکوں نے پُرامن انداز میں کام کرنے کی راہیں مسدود پا کر دہشت گردی کی راہ اختیار کر لی جس کی وجہ سے مغربی طاقتوں اور لادینی عناصر کو ان کو کچلنے اور مٹانے کا بہانہ ہاتھ آ گیا' ڈاکٹر صاحب کا یہ دعویٰ یا تنقید بھی بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن اگر ذرا غور سے دیکھیں تو دہشت پسندی کی راہ کو اختیار کرنا بھی درحقیقت عجلت پسندی ہی کا

شاخسانہ ہے۔ مکّی دَور میں بہت سے صحابہ کرام کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ ان کو بھی کفار کے تشدد کا جواب تشدد سے دینے کی اجازت مل جائے' لیکن جب تک مدینہ میں مسلمانوں کی آزاد ریاست قائم نہ ہوگئی اُس وقت تک قوت کے استعمال کی اجازت نہ ملی اور اجازت ملنے کے بعد بھی انفرادی طور پر کسی کو قوّت استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی' بلکہ یہ حق صرف مملکت اور اس کے سربراہ کو حاصل تھا' کیونکہ تشدد یا طاقت کا یہ استعمال قطعی طور پر اسلام کی تعلیمات یا ہدایت اور احکام کے مخالف ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق طاقت استعمال کرنے کی مجاز صرف ایک بااقتدار اسلامی ریاست اور اس کا سربراہ ہے۔ یہ محض عجلت پسندی ہی ہے جس کی وجہ سے احکامِ اسلامی کو پس پشت ڈال کر کوئی فرد یا افراد یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اب اقامتِ دین اور غلبۂ اسلام کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ جو لوگ اس کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہیں ان کو قوت و طاقت کے ذریعے ہٹا دیا جائے۔

غور کیجئے مکّی دَور میں بالخصوص جبکہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسے لوگ ایمان لا چکے تھے' کیا نبی ﷺ ابولہب اور ابوجہل جیسے چند سرداروں کو راہ سے ہٹانے کے لئے خفیہ انداز میں یا علانیہ طور پر طاقت کا استعمال کرنے کا فیصلہ نہ کر سکتے تھے؟ لیکن نہیں! تیرہ سال تک مکّہ میں ہر قسم کا ظلم و ستم سہنے کے باوجود آپؐ نے طاقت کے استعمال کی کسی کو اجازت نہ دی۔ البتہ مدینہ پہنچ کر جب اسلامی ریاست قائم ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے اعلان فرما دیا:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ o الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ﴾ (الحج: ۳۹)

''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو (طاقت استعمال کرنے کی) جن کے خلاف طاقت استعمال کی جاتی رہی ہے' (یہ اجازت اس لئے دی گئی) کہ ان پر ظلم کیا جاتا رہا حالانکہ اللہ تعالیٰ بے شک ان کی مدد کرنے پر قادر رہا ہے۔ جو اپنی بستیوں سے ناحق نکالے گئے' اس کے سوا (ان کا کوئی گناہ نہ تھا) کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا ربّ اللہ ہے''۔

اس وجہ سے طاقت کا وہ استعمال جو بعض اسلامی گروہوں نے بااقتدار ہونے سے قبل شروع کر دیا تھا' ان کا یہ فعل خواہ نیک نیتی اور غیرتِ ایمانی کے تحت ہو بہرحال احکامِ اسلامی کے خلاف ہے۔ البتہ ان کے اس اقدام کو دہشت گردی کے الفاظ سے تعبیر کرنے کے بجائے اس کو خلافِ شرع طاقت کا استعمال کہنا میں زیادہ پسند کرتا ہوں' کیونکہ ''دہشت گردی'' کی اصطلاح کو مغربی طاقتوں نے اپنے مذموم مقاصد کے لئے ہائی جیک کرلیا ہے۔

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ناکامی کے جو تین اسباب بیان کئے ہیں ان کے علاوہ اور بھی متعدد اہم اسباب ہیں جن کی وجہ سے اسلامی تحریکوں کو ہزیمت اٹھانی پڑ رہی ہے۔ ان اسباب میں سے اہم ترین سبب میرے نزدیک اہم فیصلوں کے لئے اصولِ مشاورت کے اسلامی حکم پر عمل کرنے میں غفلت یا کوتاہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد

﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾

''اور ان (مسلمانوں) کے معاملات باہم مشاورت سے طے پاتے ہیں''

کا تقاضا ہے کہ تمام اجتماعی اور اہم فیصلے باہم مشاورت کے ذریعے کئے جائیں۔ بلکہ آیت کے عموم کا تقاضا تو یہ ہے کہ تمام اداروں کا نظم چلانے میں' شراکت پر مبنی صنعتی اور تجارتی امور میں' حتیٰ کہ خاندان کے مسائل اور معاملات میں بھی تمام فیصلے مشاورت سے ہونے چاہئیں۔ چنانچہ خاندان کے سربراہ کو نہ صرف اپنی شریکِ حیات کو بلکہ اپنی بالغ اولاد کو بھی مشاورت میں شریک کرنا چاہئے۔

مشاورت کے آداب میں یہ امور شامل ہیں:

(ا) مشاورت بالکل آزادانہ ماحول میں ہو' رائے دینے والوں پر کوئی ذہنی یا جسمانی دباؤ نہ ہو۔ دباؤ کی حسبِ ذیل صورتوں کا ذکر مناسب بلکہ ضروری محسوس ہوتا ہے۔

(ا) شخصیت پرستی کا دباؤ جس کی وجہ سے مشاورت میں شریک افراد یہ سمجھ لیں کہ فلاں حضرت یا فلاں صاحب جو رائے دیں گے وہ سراسر حق اور مصالح پر مبنی ہو

گی' اس لئے اس سے اختلاف کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سربراہ کو کسی معاملے میں مشاورت سے قبل حتی الوسع اپنی رائے کے اظہار سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اس سلسلے میں نبی ﷺ کا اُسوہ بہت واضح ہے۔ آپ نے صحابہ کرامؓ میں آزادئ اظہار اور رائے کی آزادی نہ صرف پیدا کی بلکہ اس چیز کو اتنی بلندی تک پہنچا دیا کہ ایک آزاد کردہ لونڈی نے اپنے ذاتی مسئلہ میں آنحضرت ﷺ کی سفارش کو یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ اگر یہ آپ کا حکم نہیں بلکہ محض مشورہ ہے تو میں اسے قبول نہیں کر سکتی۔

البتہ نبی کی حیثیت سے آپ نے چند خاص مواقع پر مشاورت کے بغیر بعض فیصلے کئے ہیں' مگر یہ وہ مواقع ہیں جہاں اگر مشاورت کی جاتی تو فیصلے سے حاصل ہونے والے فائدوں کے ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔ مثلاً صلح حدیبیہ کے موقع پر اگر آپ واضح کر دیتے کہ میں دو دشمنوں' مشرکین مکہ اور خیبر کے یہود میں سے ایک دشمن کی طرف سے وقتی طور پر مطمئن ہونا چاہتا ہوں تا کہ دوسرے دشمن کا قلع قمع کر سکوں تو مشرکین صلح پر آمادہ نہ ہوتے یا مزید کڑی شرطیں لگا دیتے۔

ب) بامعاوضہ کارکن ہونے کی صورت میں بے روزگاری کے خطرے کا دباؤ

ج) امیر کے حق استرداد (ویٹو) کا دباؤ

(۲) مشاورت کے آداب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ زیر مشاورت معاملے کی اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے مشاورت کے دائرے کو بھی وسیع اور اہم تر لوگوں پر مشتمل ہونا چاہئے' مثلاً طالبان اور القاعدہ نے جو فیصلے کئے چونکہ وہ پوری اُمت مسلمہ پر اثر انداز ہونے والے تھے اس لئے یا تو اُن کو اس قسم کے فیصلوں سے اجتناب کرنا چاہئے تھا یا پھر مشاورت کے دائرے کو اُمت کے ان تمام افراد تک پھیلا دینا چاہئے تھا جو صاحبِ علم وفکر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہوئے۔

اگر طالبان اور القاعدہ کے لوگ مشاورت کے اس ادب کا لحاظ رکھتے تو وہ ان بہت سے غلط سیاسی فیصلوں سے محفوظ رہتے یا کم از کم ان کے بُرے اثرات ونتائج سے

بچ جاتے جوانہوں نے اپنے غلط سیاسی اقدامات کی وجہ سے بھگتے ہیں اور بھگت رہے ہیں۔ ایران میں انقلاب کے بعد ایرانی قیادت کو برآمد کرنے کے بلند بانگ دعوے کئے گئے اور ایران نے اپنی خارجہ پالیسی میں اس کو اساسی مقام دیا۔ لیکن جلد ہی ایران کو پتہ چل گیا کہ انقلاب کو برآمد کرنے کی یہ کوشش خود ایران کے وجود کو خطرے میں ڈال دے گی۔ چنانچہ جلد ہی انہوں نے ایران کے استحکام کو اوّلیت دینے کا فیصلہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی عالمی طاقتوں کی دشمنی کے باوجود ایران نہ صرف زندہ ہے بلکہ اپنے راستے پر استحکام کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔

ناکامی کے اسباب میں سے پانچواں سبب وہی ہے جس کو مولانا مودودیؒ نے سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک کی ناکامی کے اہم سبب کی حیثیت سے بیان کیا ہے' یعنی اس مادی اور تکنیکی قوّت وصلاحیت اور اس کے حصول کے ذرائع کی طرف سے غفلت' جس مادّی قوّت اور تکنیکی صلاحیت سے مغرب مسلح ہے۔ یقیناً اس معاملے میں بھی القاعدہ اور طالبان نے اسلامی احکام و ہدایات کی طرف سے غفلت کا ثبوت دیا' جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ.....﴾ (الانفال: ٦٠)

''اور ان (کے مقابلے) کے لئے اپنے بس کے مطابق تیار کرو ہر طرح کی قوّت اور گھوڑوں کے دستے.....''

پھر اس تیاری کی حد مقرر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (الانفال: ٦٥)

''چنانچہ اگر تمہارے اندر سو ثابت قدم رہنے والے (جنگجو) ہوں تو وہ دو سو پر اور اگر ایک ہزار ہوں تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آجائیں گے۔''

لہٰذا جنگی تیاری کو اسی پیمانے کے مطابق بڑھانا ضروری ہے۔

تلافی کا ربّانی نظام

آخر میں ایک اور اصولی بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے' جس کو پیش نظر

رکھنے سے نظامِ کائنات کو محض سطحی اور ظاہری آنکھ سے دیکھنے سے جو مسائل اور الجھنیں پیدا ہوتی ہیں ان کا جواب اور حل نگاہوں کے سامنے آجائے گا۔

وہ بات یہ ہے کہ مادی اسباب کی وجہ سے کسی فرد یا افراد کو اگر کوئی ناپسندیدہ یا تکلیف دہ صورت پیش آجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ بالعموم اسباب کے عمل کو تو نہیں روکتا تاہم اس عمل سے جس فرد یا افراد کو کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے اس کی تلافی لازمی طور پر کردی جاتی ہے۔ اگر حالات اجازت دیتے ہیں تو دنیا میں ہی اس کی تلافی کردی جاتی ہے۔ مثلاً اگر پیدائشی طور پر کوئی آنکھ سے محروم رہ جاتا ہے تو اس کی انگلیوں کے احساس کی قوت بہت بڑھ جاتی یا اس کا حافظہ بہت تیز ہو جاتا ہے۔

لیکن مادّی اسباب و حالات کی بناء پر اگر تلافی نہ ہو سکے یا بھرپور تلافی نہ ہو سکے تو اس صورت میں ایسے شخص کی زندگی کے دوسرے دَور میں اس کی بھرپور تلافی کردی جاتی ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ ''اگر میں کسی کی دونوں پیاری آنکھیں لے لیتا ہوں تو میرے پاس اس کے علاوہ اس کا اور کوئی معاوضہ نہیں ہے کہ میں اس کو جنت میں داخل کردوں''۔

اسی طرح ایک اور حدیث شریف میں مذکور ہے: ''ایک شخص جس نے دنیا میں دکھ ہی دکھ، تکلیفیں ہی تکلیفیں دیکھی ہوں گی، جب اس کو جنت میں ایک غوطہ دیا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا کہ تُو نے کبھی تکلیف یا دکھ بھی جھیلا ہے تو وہ کہے گا: نہیں، میں نے تو کبھی کوئی دکھ یا تکلیف دیکھی ہی نہیں۔''

اسی طرح جو لوگ اسلام کے غلبے اور دینِ حق کے قیام کی راہ میں مشقتیں اور تکلیفیں برداشت کرتے ہیں حتیٰ کہ اپنی جانیں بھی اسی مقصد کے لئے پیش کردیتے ہیں وہ اگر مخلص ہیں اور محض اللہ کی رضا کے لئے اس جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں، پھر اپنی کسی دُنیوی تدبیر کی غلطی یا نامساعد حالات اور ناسازگار اسباب کی وجہ سے شکست اور ہزیمت سے دوچار ہوتے ہیں، یا مال و اسباب سے محروم ہوتے ہیں یا اپنی جانیں اسی راہ میں دے دیتے ہیں تو ان کا یہ عمل ہرگز خسارے کا سودا نہیں، بلکہ یہ تو فوزِ عظیم ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ط یُقٰتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ق وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ ط وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ o﴾ (التوبۃ : ۱۱۱)

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والوں سے جنت کے بدلے میں ان کی جانوں اور اموال کا سودا کرلیا ہے (کہ) وہ اللہ کی راہ میں جنگ کریں تو وہ قتل کریں اور خود بھی قتل ہوں' اللہ کا یہ سچا وعدہ ہے توریت میں' انجیل میں اور قرآن میں' اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے!! تو تم اپنے اس سودے پر خوش ہو جاؤ' اور یہی زبردست کامیابی ہے''۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تحریکوں میں جن لوگوں نے خالص نیت کے ساتھ قربانیاں دیں' چاہے ان کا تعلق سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک سے ہو یا آج کی تحریک القاعدہ اور طالبان سے' ان سب کے لئے (ان شاء اللہ) اللہ کا یہ وعدہ ہے۔ چنانچہ جامِ شہادت نوش کرتے ہوئے ان میں سے ہر شخص کہہ سکتا ہے:

فُزْتُ بِرَبِّ الْکَعْبَۃِ

''کعبہ کے ربّ کی قسم! میں تو کامیاب ہوگیا!''

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے بعض ذاتی اور مالی و معاشی کوائف پر مشتمل

حسابِ کم و بیش

کا نیا ایڈیشن جسے update کرنے کی خاطر امیر تنظیم کی چار صفحات پر مشتمل ایک تازہ تحریر ''پس نوشت'' اور نائب امیر کا تحریر کردہ مختصر ''ضمیمہ'' کا اضافہ کردیا گیا ہے'

دبیز سفید کاغذ' صفحات 68' عمدہ طباعت' قیمت فی نسخہ -/15 روپے

اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰھِیْمَ

تحریر: محمد منیر احمد

قرآن کریم گواہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بچپن ہی سے غیر اسلامی ماحول اور معاشرے سے نفرت کرتے تھے' لہٰذا انہوں نے اس غیر اسلامی ماحول اور معاشرے کو تبدیل کرنے کے لئے جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ غیر اسلامی ماحول سے بیزاری ہی ابراہیم علیہ السلام کی بے چینی کا اصل سبب تھی لہٰذا وہ مسلسل حالت جہاد میں رہے۔ بالآخر غیر اسلامی ماحول اور معاشرے کے پاسبانوں نے ابراہیم علیہ السلام کو قتل کی کوشش میں ناکامی کے بعد وطن سے نکال دیا۔ ابراہیم علیہ السلام ہجرت پر مجبور ہوئے تو شام کے ریگستانوں کا رخ کیا۔ ایک عرصہ تک ان ریگستانوں میں اسلامی معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن کسی کامیابی کے آثار ابھی دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے کہ آپؑ کو بڑھاپے کا احساس ہوا۔ چونکہ ابھی تک ان کی کوئی اولاد نہیں تھی لہٰذا دل سے دعا نکلی کہ اگر اللہ مجھے نرینہ اولاد عطا فرما دے جو میرے بعد بھی اس جدوجہد کو جاری رکھے تو شاید میری اولاد کے ذریعے ہی میری یہ جدوجہد کامیاب ہو جائے۔ دعا قبول ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو حجاز میں آباد کر کے اُمت کے لئے ایک مرکز یعنی خانہ کعبہ کی تعمیر کرو۔ تعمیر کعبہ کے وقت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو سال اور اسماعیل علیہ السلام کی تیرہ سال تھی۔

تعمیر کعبہ کے دوران ہی آپؑ کو خیال آیا کہ میرے اور اسماعیل علیہ السلام کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ہماری نسل میں تو متواتر اضافہ ہو گا اور خدائی تعلیمات یقیناً آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہوتی چلی جائیں گی' کاش اللہ تعالیٰ اُس وقت میری اس نسل کی راہنمائی کے لئے ہادی بھیج دے۔ چنانچہ دل سے دعا نکلی:

﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ﴿ (البقرۃ: ۱۲۹)

''اے ہمارے ربّ! ان میں ایک رسول بھیجنا جو ان ہی میں سے ہو اُن کو تیری آیات پڑھ کر سنائے، انہیں اللہ کی کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کا تزکیہ کرے۔''

ابراہیم علیہ السلام عراق کے رہنے والے تھے لیکن جب وہ شام اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں دین کی دعوت کا کام کر رہے تھے تو مقامی لوگوں کی زبان مختلف ہونے کے سبب خود ان کو اس کام کے دوران مشکلات پیش آئیں جن کے پیش نظر وہ خوب جانتے تھے کہ تبلیغ ہدایت کے لئے اللہ کے کلام کی زبان اور عوام الناس کی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اپنی نسل کی ہدایت کے لئے اتنے فکر مند تھے کہ انہوں نے اپنی دعا میں یہ چیز بھی شامل رکھی کہ آنے والا رسول میری اسی نسل سے ہو تا کہ ابلاغ میں کوئی دقت پیش نہ آئے اور جیسے ہی رسول کی زبان سے کلامِ الٰہی ادا ہو، فوراً ابلاغ کا حق ادا ہو جائے۔ چنانچہ دیکھئے ادھر عمرؓ نے کلامِ الٰہی کے چند جملے سنے اُدھر ابلاغ کا حق ادا ہو گیا اور دشمن خدا اور مخالفِ رسول کی کایا پلٹ گئی اور نتیجتاً وہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ مشہور ہوئے۔ یہی چیز ابراہیم علیہ السلام بھی چاہتے تھے کہ حق ابلاغ ادا ہو جائے تا کہ جو حق کو قبول کرے وہ شعوری طور پر قبول کرے اور جو مخالفت کرے وہ بھی شعوری طور پر مخالف ہو۔

ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بھی اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی صورت میں قبول فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کی قبولیت کو اپنا بہت بڑا احسان قرار دیا۔ (آل عمران: ۱۶۴) محمد رسول اللہ ﷺ ابراہیمؑ کی خواہش کے عین مطابق مکہ میں لوگوں کے سامنے کلام الٰہی کی آیات پڑھتے۔ جو ایمان لے آتا اسے کتاب وحکمت کی تعلیم دی جاتی تا کہ وہ بھی داعی الی اللہ بن سکے۔ ایمان کے بعد کتاب وحکمت کی تعلیم سے اس کا تزکیہ ہو جاتا۔

اس طرح جب کچھ عرصہ بعد داعیانِ حق کی ایک جماعت وجود میں آ گئی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں تلوار پکڑ کر ایک اسلامی معاشرے کے قیام کا حکم دیا۔ (البقرۃ: ۱۹۰ تا ۱۹۵) چنانچہ اب اس رسول کے ماننے والوں کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے

میں تلوار تھی۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد تک دنیا کی دو سپر طاقتیں قیصر اور کسریٰ زمین بوس ہو گئیں اور ان کی جگہ ایک سپریم طاقت خلافت اسلامی نے لے لی۔ ابراہیمؑ اگرچہ خود تو اسلامی معاشرہ قائم نہ کر سکے لیکن ان کی نسل کے ہاتھوں یہ کام انجام پا گیا۔

خلفائے راشدین وصحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے دور کے بعد بہت بڑی سلطنت کے حصول اور دولت کی فراوانی کے باعث مسلمانوں کے امراء اور دولت مند طبقے میں بے راہ روی کی خواہشات نے جنم لیا۔ لیکن ان کے لئے اپنی ان شیطانی خواہشات کی تکمیل آسان نہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جو اُمت خلیفہ وقت عمرؓ سے عین خطبہ کے دوران دو چادروں کا حساب مانگ سکتی ہے اور جس کا خلیفہ قانون اور نظام کا اس قدر احترام کرتا ہو کہ اپنی ہی بنائی ہوئی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو کر اپنے لئے انصاف طلب کرتا ہو اور جس کا رسول یہ بتا گیا ہو کہ بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے اور جس کو قرآن عدل و انصاف کے علمبردار بن کر کھڑے ہونے کی ذمہ داری سونپتا ہو وہ امت انہیں ان شیطانی خواہشات کی تکمیل کی اجازت نہیں دے گی۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لئے گہری سازش تیار ہوئی۔ حق پرست علماء کی بے قدری اور حوصلہ شکنی شروع ہوئی اور حکومتی سرپرستی میں علماء کی ایک فوج تیار کی گئی جنہوں نے لوگوں کو یہ سمجھانا شروع کیا کہ دین الگ ہے اور دنیا الگ' سیاست الگ ہے اور شرافت الگ۔ اللہ کے مقرب بندے بننے کے لئے نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' تہجد' اشراق' اوّابین' مسواک کا جیب میں رکھنا' شلوار کا اونچا ہونا اور چلتے پھرتے تیسرے کلمہ کا ورد کرنا ہی کافی ہے۔ رہا قرآن تو وہ هُدًى لِّلنَّاسِ ہوتے ہوئے بھی انسانوں کے سمجھنے کی چیز نہیں بلکہ سمجھنے کی کوشش میں بھی آدمی گنہگار ہوتا ہے' البتہ بغیر سمجھ کر پڑھیں تو نیکیوں میں اضافہ ہوتا ہے اور اصلاً یہ ہے بھی اسی لئے۔ اس سازش کے نتیجے میں قرآن فہم وتفکر کے لئے بند کر دیا گیا۔ اب امراء اور دولت مند طبقہ آزاد تھا۔ کہیں کسی نے روک ٹوک کی تو قید خانے کافی تعمیر ہو چکے تھے۔ بے راہ روی یہاں تک پہنچی کہ مسلمان خلفاء چار چار نکاح تو بلا روک ٹوک کرنے کا حق رکھتے ہی تھے' اس کے ساتھ

ساتھ سینکڑوں لڑکیاں لونڈیوں کے نام پر ہر وقت خلیفہ کے لئے تیار رہتیں۔ جب یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ محل کے دربان' خانسامے' مالی اور ملازم ان عورتوں کے ساتھ تعلقات استوار کر کے خلیفہ کو ناجائز وارث مہیا کرنا نہ شروع کر دیں تو مَردوں کو حکیموں کے کشتوں سے نامَرد کر کے خواجہ سرا کے روپ میں محلوں میں ملازمت کروائی جاتی۔

مسلمان امراء نے قرآن تو خود بند کروایا تھا لیکن تلوار کی افادیت سے وہ خوب آگاہ تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ ان کا اقتدار تلوار ہی سے قائم ہے اور اس میں وسعت بھی اسی کے طفیل ہوتی ہے۔ لیکن کردار کے کھوٹ اور رب سے بے وفائی کی وجہ سے اب وہ تلوار کو سنبھالنے کے قابل بھی نہ رہے۔ اللہ کا عذاب آیا اور دنیا کی سپریم پاور امت مسلمہ کو تاتاریوں نے یوں پاؤں تلے روندا کہ شاید چیونٹیوں کو بھی اس طرح روندنا اتنا آسان نہ ہو۔ اسلامی خلیفہ انتہائی ذلت آمیز طریقے سے قتل ہوا۔

اتار چڑھاؤ تو خیر آتے رہے لیکن رجوع الی القرآن کسی بھی دولت مند مسلمان کو راس نہ تھا۔ مسلمان قرآن اور تلوار دونوں سے بیگانہ تھے۔ مسلمانوں کا دین دار طبقہ بدھ مت کے بھکشوؤں کی ہی عکاسی کرتا تھا۔ اسی اثناء میں اللہ کے ایک بندے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کو مسلمانوں کی ذلت اور خواری فہم قرآن سے دوری میں نظر آئی۔ انہوں نے قرآن کا فارسی میں ترجمہ شائع کر دیا تاکہ فہم قرآن آسان ہو۔ سینکڑوں علماء نے ان کو کافر' مرتد اور واجب القتل قرار دے کر فتویٰ جاری کر دیا۔ شدید مخالفتوں کے باوجود انہوں نے فہم قرآن کی تحریک چلا دی جو آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی۔ حسن اتفاق دیکھیں' جیسے ہی رجوع الی القرآن کی تحریک کا آغاز ہوا تو تھوڑے ہی عرصہ بعد رجوع الی السیف کی تحریک بھی سید احمد شہیدؒ کے ہاتھوں شروع ہوگئی۔ الحمدللہ اب دونوں تحریکوں کو کافی فروغ مل چکا ہے اور مسلمانوں کا ایک گروہ اب دین کی سربلندی کے لئے رجوع الی القرآن والسیف کی برکت سے آشنا ہو چکا ہے اور سمجھ چکا ہے کہ ہماری معاشرت' معاش اور سیاست کو قرآن وسنت کے تابع ہونا چاہئے۔

دوسری جانب مسلمان امراء نے اپنی بے راہ روی کے جواز کے لئے جو فوج تیار

کی تھی کہ وہ مسلمانوں کو نیا تصور دین دے وہ بھی خوب پھلی پھولی' یہاں تک کہ تصور دین محض نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' اشراق' اوّابین' تہجد اور کھڑے بیٹھے ذکر واذکار میں مصروف رہنا ہی سمجھا جانے لگا۔ مسلمان حکومتوں کے خاتمے کے بعد اس طبقے کو بھی اسلام کی سربلندی کا خیال آیا لیکن اسی تصور کے مطابق جو تصور وہ رکھتے تھے۔ اس خواہش نے تحریک کی شکل اختیار کی۔ چونکہ ان کی یہ تحریک کسی نظام کے خلاف نہیں بلکہ مسلمانوں کو بدھ مت کی طرز پر مسلمان بنانے کی کوشش تھی' نیز حکمران طبقہ ہمیشہ سے ایسے شریف لوگوں کو مضبوط کرتا جو ان کے اقتدار اور مفادات کے لئے خطرہ نہ ہوں اور دوسروں کو بھی یہی وعظ و نصیحت کریں' چنانچہ دنیا کے اندر ہر جگہ اس تحریک کو خوش آمدید کہا گیا۔

یہ وہ دینی تحریک ہے جس میں قرآن کے فہم کو غیر ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ان کی مسجد میں ترجمہ والے قرآن کو تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی مسجدوں میں درس قرآن کی اجازت نہیں ہوتی۔ اپنی تحریک کی حرکت کو یہ ابراھیمعلیہ السلام کی جلاوطنی' محمد ﷺ کی ہجرت مدینہ اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی لشکر کے ساتھ جنگ کے لئے روانگی سے بڑی معصومیت سے تشبیہہ دے لیتے ہیں۔ کاش کوئی ان کو سمجھائے کہ محمد ﷺ اور ابراھیمعلیہ السلام چلہ لگانے نہیں گئے تھے اور ابوایوب انصاریؓ تو ہاتھ میں تلوار لے کر گئے تھے۔ کاش کوئی ان کو سمجھا دے کہ آل عمران: ۶۸ میں محمد ﷺ اور صحابہؓ کو **اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ** اس لئے کہا گیا کہ انہوں نے ایک غیر اسلامی معاشرے کے خلاف ابراہیمؑ ہی کی طرح کشمکش کے بعد ہجرت کی اور ابراھیمعلیہ السلام کی خواہش کے عین مطابق ان کو قرآن کا فہم بھی حاصل تھا اور وہ قرآن ہی کے ذریعے تبلیغ کرتے تھے۔ کاش کوئی انہیں یہ سمجھا دے کہ دین کی بنیاد قرآن ہے اور جس دینی جماعت کے ساتھ وابستہ لوگ فہم قرآن سے ناآشنا ہیں' وہ سرے سے دینی جماعت کہلانے کا حق ہی نہیں رکھتی۔ کاش یہ لوگ رجوع الی القرآن اور رجوع الی السیف کی اہمیت سمجھیں!

تعارف ودعوتِ تنظیم اسلامی

تحریر: ڈاکٹر منظور حسین

تنظیم اسلامی ایک اصولی انقلابی تنظیم ہے جو اوّلاً پاکستان میں اور ثانیاً پوری دُنیا میں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو غالب و قائم کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ پوری اُمتِ مسلمہ میں تنظیم اسلامی کی حیثیت فارورڈ بلاک کی سی ہے جو قرآن کریم کے حرکی تصوّر کو عام کر کے اُمتِ مسلمہ کو اپنی غرضِ تاسیس (دعوت الی الخیر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لئے سرگرم عمل ہے۔ اُمت مسلمہ کی اکثریت اسلام کو ایک موروثی عقیدہ' قرآن کریم کو ایک مقدّس صحیفہ اور محمد رسول اللہ ﷺ کے محض دامن سے وابستہ ہو جانے کو نجات وفلاح کا مدار بنائے بیٹھی ہے۔ عقیدہ وعمل کی بعض کج فہمیوں نے مسلمانوں کی اکثریت کو فکر وعمل کے تضادات کا شکار بنا کر رکھ دیا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اُمت مسلمہ کی اس حالت زار کی نقشہ کشی یوں فرمائی ہے کہ:۔

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ!

گزشتہ اُمتِ مسلمہ کی مانند مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اُمتِ محمدی بھی انحطاط کا شکار ہوئی اور اب اُمت کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ محض اُمتِ محمدی میں شمار یا زیادہ سے زیادہ ارکانِ اسلام کی پابندی ہی کو مدارِ نجات سمجھتی ہے اور اس زعم میں مبتلا ہے کہ۔

خوار ہیں' بدکار ہیں' ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی اُمت میں ہیں!

فکر وعمل کی ان بھول بھلیوں کے اسباب میں عوام النّاس کو مبتلا کرنے میں ان کی اپنی سہل انگاری کے ساتھ ساتھ علماءِ سوء' رھبانِ دُنیا پرست اور ملوکِ جاہ پرست کا بھی عمل

دخل اور گٹھ جوڑ ہے' جس کو سیاسی و مذہبی استحصال کے بنّاض ایک بزرگ نے بڑے ہی احسن طریق پر یوں بیان فرمایا تھا" مَا اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْکُ وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَرُھْبَانُھَا" (عبداللہ بن مبارکؒ) لہٰذا اپنی قومی' ملی اور دینی ذمہ داریوں سے لاپرواہی نے پوری اُمت کو ذلت و رسوائی سے دوچار کر دیا ہے۔ اُمت مسلمہ کو اس قعرِ مذلت سے نکالنے اور اس کو اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لئے تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جس کے داعیٔ اوّل کی حیثیت محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو حاصل ہے۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے قرآن کریم کے ذریعے سوئی ہوئی اُمت کو جگانے کا بیڑا اٹھایا ہے اور ترجمان القرآن علامہ اقبال کے درج ذیل اشعار کے مطابق تجدید و احیاءِ دین کی جانب پکار لگائی ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا' شجاعت کا' عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا!

اور

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!

تنظیم اسلامی قرآن مجید کے ذریعے دین کے بنیادی فرائض کی دعوت اور توحید باری تعالیٰ پر ایمان کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں کی ادائیگی کے لئے میدانِ عمل میں اُتری ہے' جس کے شرکاء کا نصب العین رضائے الٰہی کا حصول اور ہدف رفقائے تنظیمِ اسلامی کی اصلاح اور فلاحِ دُنیا و آخرت ہے' اور اس نے تعلیم' تنظیم' تربیت و تزکیہ نفس اور تعمیرِ سیرت و تہذیبِ اخلاق کے لئے مرکز و محور قرآن کریم ہی کو بنایا ہے۔

تنظیم اسلامی کے اربابِ حل و عقد نے ابتدا ہی میں یہ طے کر دیا تھا کہ ہم مروّجہ انتخابی سیاست سے کامل کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے " اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃ" کے اصول پر عمل پیرا ہو کر اربابِ اقتدار' معاشرہ کے ذہین افراد اور عوام النّاس کو دعوتِ رجوع الی القرآن دیں گے۔ اور جو افرادِ اُمت قرآن مجید کی اس پکار پر لبیک کہیں گے ان کی

تربیت اور تنظیم کر کے ایک حزب اللہ تشکیل دیں گے جو قرآنی نظامِ عدلِ اجتماعی کی تنفیذ کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے۔ یہ تمام تر تربیت و تزکیہ و تنظیم بھی طریق نبویؐ ہی کی بنیاد پر ہو گا۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی اہم کام کے لئے مقصد اور طریق کار دونوں نہایت بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مقصد میں ٹارگٹ پر نگاہ رکھنی ہوتی ہے اور طریق کار میں ہر ہر مرحلہ کے لوازم پر توجہ دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کا توازن ہی مطلوبہ کام کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کا ضامن ہوتا ہے۔

جب ایسے معتد بہ افراد تیار ہو جائیں گے جنہوں نے اپنے اپنے دائرہ کار میں عبادتِ ربّ کے تقاضے غالب حد تک پورے کرنے شروع کر دیئے ہوں گے تو ان کو منظّم کر کے باطل نظام کو چیلنج کیا جائے گا۔ پُر امن اور منظّم احتجاجی مظاہروں سے متفق علیہ منکرات کو ہدف بنایا جائے گا۔ پھر یا تو نام نہاد مسلمان حکومت پسپائی اختیار کرتی چلی جائے گی اور منکرات کا خاتمہ ہوتا جائے گا یا پھر حکومت اپنی جھوٹی انا کی خاطر رفقائے تنظیم اسلامی پر تشدّد کرے گی' انہیں جیلوں میں ڈالے گی' شہادت تک کی نوبت بھی آئے گی۔ تنظیم اسلامی ایسے موقع پر نظامِ حق کو جاری کرنے کی غرض سے سر پر کفن باندھ کر میدان میں آئے گی۔ حق غالب ہو گا یا پھر شہادت کی موت نصیب ہو گی۔ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیوں سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔

تنظیم کی ضرورت

تنظیم یا جماعت یعنی حزب اللہ کی تشکیل اس لئے بھی ضروری ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے اور بالخصوص ہمارا دین بھی اجتماعیت پسند ہے۔ اپنی ہی ذات کی تکمیل میں لگے رہنا یا رہبانیت اختیار کرنا اسلام سے جوڑ میل نہیں رکھتا۔ بین الانسانی معاملات میں اگر آپ اللہ کے بندے بن کر اللہ اور رسول ﷺ کی وفاداری پر چلنا چاہیں' جب تک ماحول سازگاری اور موافقت نہ دے' آپ اس میدان میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب مجموعی ماحول خاص طور پر اجتماعی زندگی کے گوشوں میں یک رنگی و ہم آہنگی آ جائے' جسے قرآن کریم صِبۡغَةَ اللّٰهِ کا نام دیتا ہے۔ جس طرح ایک مشین کے

بے ترتیب اور بے تنظیم پرزے نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے بعینہٖ بے ہنگم اجتماعیت بھی کوئی مثبت نتائج نہیں دے سکتی۔

انسانیت کا اصل مسئلہ آخرت کی فوز وفلاح حاصل کرنا اور خسران سے بچنا ہے۔ لہٰذا تنظیم اسلامی کے نزدیک آخرت کی کامیابی کو بہرحال بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ آخرت کی فلاح اور رضائے الٰہی کی سچی طلب اگر افراد کے قلوب واذہان میں پیدا کر دی جائے تو ایسے ہی افراد کا مجموعہ وعدۂ الٰہی (تمکن فی الارض/خلافت فی الارض) کا سزاوار قرار پاتا ہے۔ مگر یہی مرحلہ (دعوت، تنظیم، تربیت وتزکیہ) صبر آزما اور پتہ مار ریاضت کا متقاضی ہوتا ہے۔ عجلت پسندی چونکہ انسانی سرشت میں موجود ہے لہٰذا تحریکیں اٹھتی ہیں، چند منزلیں طے کرتی ہیں اور پھر داعیّت سے مدعیت کا شکار ہو کر خود ہی مطلوب ومقصود اور بُت بن جاتی ہیں۔ اپنے آپ کو عقلِ کُل سمجھتی ہیں اور اَنَا وَلَا غَیْرِیْ کے مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں۔ اقتدار کا حصول ان کا مطلوب ومقصود بن جاتا ہے۔ پہلے اقتدار پھر اس کے زور پر اسلام کی تنفیذ ان کا MOTTO قرار پاتا ہے۔ مگر تنظیم اسلامی کی تشخیص یہ ہے کہ نفوذِ اسلام کے بغیر نفاذِ اسلام دیوانے کا خواب ہے، جس کا ماضی کی تحریکیں شکار رہیں۔ تنظیم اسلامی شعوری طور پر اس دامِ فریب سے بچنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ تنظیم اسلامی کے نزدیک اقتدار کا استعمال تو ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر ان شہریوں پر ہوتا ہے جو محبت کے رمز آشنا نہ ہوں۔ فرد اور اجتماعیت دونوں اگرچہ لازم وملزوم ہیں، مگر فرد کے فکر وعمل کی اصلاح کئے بغیر کسی معاشرے میں کوئی تبدیلی لانا ممکن نہیں ہے۔ اقتدار ایک ناگزیر شے ہے جو کہ اصلاً مطلوب نہیں ہے۔ یہ بھی فرد کی اصلاح کے لئے ہونا چاہئے تاکہ افرادِ ملت کے لئے فلاح ونجاتِ اُخروی کے پروگرام پر چلنا ممکن وآسان ہو، جسے علامہ مرحوم نے یوں واضح فرمایا ہے:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا

افراد اور اجتماعیت اتنے لازم وملزوم ہیں کہ ان کے مابین ترجیح محال ہے۔ جیسے فرمایا ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں!

تنظیم اسلامی کی دعوت کو ۳+۳ کے اصول پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ تین بنیادی فرائض ہیں اور تین ان کے لوازم ہیں۔ تین بنیادی فرائض درج ذیل ہیں:

۱) عبادتِ ربّ

یوں تو اس بنیادی فریضہ کو اسلام' اطاعت اور تقویٰ کی اصطلاحات سے بھی واضح کیا جاتا ہے' مگر اس کی جامع ترین اصطلاح عبادتِ ربّ ہے۔ سورۃ الذاریات میں فرمایا گیا:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۝﴾

گویا جن وانس کی غرضِ تخلیق ہی بندگی ربّ ہے۔

لفظ عبادت' عبد سے بنا ہے جس کے معنی غلامی کے ہیں۔ غلام اپنے آقا کا سراپا غلام ہوتا ہے اور اپنے مالک کے ہر حکم کو بجالانا اس پر فرض ہے۔ غلامی مارے باندھے کی بھی ہو سکتی ہے مگر اصطلاحِ عبادت میں محبت اور اطاعت کو جمع کیا جائے تو عبادت بنتی ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے عبادت کی تعریف یوں کی ہے: "اَلْعُبُوْدِيَةُ تَجْمَعُ اَصْلَيْنِ غَايَةَ الْحُبِّ مَعَ غَايَةِ الذُّلِّ وَ الْخُضُوْعِ" ۔ یہ عبادت ہمہ تن' ہمہ جہت اور ہمہ وقت مطلوب ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی لمحہ اس سے خارج نہیں۔

۲) شہادتِ علی الناس

ختمِ نبوت واتمامِ رسالت کے نتیجہ میں اس وقت کارِ رسالت کی ذمہ داری اُمتِ مسلمہ کے کاندھوں پر ہے' کیونکہ رسالتِ محمدی سے قبل جب بھی انسانیت گمراہ ہوتی تو ربِّ کریم ان کی اصلاح کے لئے وحی اور نبی و رسولؑ ارسال فرماتے۔ اب باطل تو اپنے پورے لاؤلشکر سمیت گمراہی پھیلا رہا ہے لیکن ختم نبوت کے نتیجہ میں کوئی اور رسول

یا نبی آنا نہیں' لہٰذا قرآن کو جو کہ اللہ کی آخری کتاب ہے' ہاتھ میں لے کر پوری انسانیت تک اس کا ابلاغ اب اُمتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے۔ بدقسمتی سے اُمت کی اکثریت یہ ذمہ داری بھول چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تنظیم اسلامی کو یہ شعور بخشا ہے کہ وہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے کمربستہ ہو۔ اس بنیادی فرض کی بھی تین بنیادی اصطلاحات ہیں' یعنی دعوت' تبلیغ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر' مگر جامع ترین اصطلاح شہادت علی الناس ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (آیت ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہو جائے''۔

قرآن حکیم میں یہ اصطلاح متعدد مقامات پر آئی ہے۔

۳) اقامتِ دین

تیسرا بنیادی فرض' دین کی اقامت کی جدوجہد ہے۔ اس کے لئے کئی اصطلاحات ہیں' مثلاً تکبیر ربّ' غلبۂ دین' اظہارِ دین' لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا اور يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ. مگر یہاں بھی اقامتِ دین جامع ترین اصطلاح ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ربّ کریم نے فرمایا: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ یعنی ''دین کو قائم رکھو (یا دین کو قائم کرو) اور اس کے قائم کرنے میں متفرق مت ہو جاؤ''۔ اسی کو قیامِ نظامِ عدلِ اجتماعی یا احیائے خلافت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

ان تین بنیادی فرائض کی بجا آوری کے لئے تین ہی لوازم ہیں۔ جیسے فرض تو ہے نماز مگر اس کے لئے طہارت اور وضو شرط ہے۔ اسی طرح مندرجہ بالا تین ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے تین شرائط ہیں۔

i) التزامِ جماعت

دُنیا میں کسی بھی کام کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے قوّت درکار ہے اور قوّت مختلف افراد کے مجموعہ سے وجود میں آتی ہے۔ مثبت کام کو تو چھوڑیئے' جیب کاٹنے' چوری کرنے' ڈاکہ ڈالنے جیسے منفی کاموں کے لئے بھی ٹیم ورک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر یہ منفی کام بھی نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح بندگیِ ربّ' شہادت علی الناس اور بالخصوص اقامتِ دین جیسے کام بغیر تشکیلِ جماعت کے ناممکن ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَo﴾ (آل عمران:۱۰۴)

''اور تم میں ایک جماعت تو لازماً ایسی ہونی چاہئے جو خیر کی طرف بلائے' نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکتی رہے۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے''۔

لہٰذا جماعت اور جمعیت لازم ہے۔ اگر یہ کام بغیر جماعت کے ممکن ہوتا تو موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) بھی کر دیتے' مگر اُمت نے جواب دے دیا جبکہ محمد ﷺ کو جاں نثاروں کی جماعت میسر آئی لہٰذا یہ انقلاب برپا ہو گیا۔

ii) بیعت

یہ جمعیت' جماعت یا حزب کس اصول پر تشکیل پائے؟ نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے ہمیں بیعت کا اصول ملتا ہے۔ آپؐ تو رسول تھے' واجب الاطاعت تھے' مگر آپؐ نے مختلف مواقع پر بیعت لے کر اپنی اُمت کے لئے رہنمائی چھوڑی کیونکہ آپؐ کا لایا ہوا دین پوری دنیا کے لئے تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے طریق بیعت کا ثبوت بخاریؒ اور مسلمؒ کی اس روایت سے ملتا ہے:

عَنْ عُبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِ (رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ) قَالَ : بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَعَلٰى اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ

''حضرت عبادہ بن صامتؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیعت لی کہ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے' خواہ مشکل حالات ہوں یا آسانی ہو' اور خواہ دلی آمادگی ہو یا اپنے آپ پر جبر کرنا پڑے' اور خواہ ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے' اور یہ کہ ہم نظم کے معاملے میں ذمہ داران سے جھگڑیں گے نہیں' اور یہ کہ ہم حق بات کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں گے' اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے''۔

بعض ارشاداتِ قرآنی' آپؐ کے اس ارشادِ گرامی اور اُسوۂ کاملہ اور آثارِ صحابہؓ کی بنا پر تنظیم اسلامی بیعتِ ہجرت و جہاد کی بنیاد پر تشکیل دی گئی ہے۔ مغرب سے درآمدہ اصولِ جماعت کو دانستہ ترک کر کے نبی اکرم ﷺ کی ایک سنّت کو زندہ کیا گیا ہے۔

iii) جہاد

عبادتِ ربّ ہو' شہادت علی الناس ہو یا فریضۂ اقامت دین کی مساعی' یہ سب منزلیں جہاد کے بغیر سر نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا ہر مرحلہ پر ایک کشمکش اور کشاکش لازم ہے۔ پہلے مرحلہ پر یہ جہاد نفس کے خلاف ہو گا جو کہ بندگی ربّ میں روڑے اٹکاتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ میں نہیں جانتا جائز و ناجائز کیا ہوتا ہے' بس میری یہ ضرورت ہے' اسے پورا کرو۔ اس مرحلہ پر قوّت ایمانی کو بروئے کار لاتے ہوئے نفس کے مُنہ زور گھوڑے کو قابو کرنا ہوتا ہے۔ ربّ کریم نے عبادات کا جو نظام عطا فرمایا ہے وہ نفس کی تربیت و تہذیب کے لئے بہت ہی کارگر ہے۔ نماز اللہ کی یاد کا کارگر ذریعہ ہے' روزہ نفس کی تربیت و تزکیہ کا مؤثر ہتھیار ہے۔ زکوٰۃ دل کے اندر مال کی محبت کو کم کر کے اللہ کی رضا سے محبت کو پروان چڑھاتی ہے جبکہ حج ان تمام مؤثرات کی جامع ترین عبادت ہے۔ دوسری سطح پر جہاد ہو گا باطل نظریات کے ابطال کے لئے۔ ربّ کریم نے ہمیں اس مرحلہ پر قرآن عظیم جیسے اسلحہ سے لیس کیا ہے اور حکم فرمایا ہے: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾

سچی بات یہ ہے کہ ان دو مراحل کے لئے ملٹری ڈسپلن والی جماعت کی کوئی

ضرورت نہیں۔ پہلی سطح پر تو ہر کسی نے اپنے نفس کے خلاف خود ہی جنگ لڑنی ہے' البتہ صحبتِ صالح اگر اختیار کی جائے تو کام قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۝﴾

جبکہ دوسری سطح پر کوئی ادارہ یا انجمن بنا کر یہ فریضہ انجام دیا جا سکتا ہے' لیکن تیسری سطح پر جہاں باطل پرستوں کے ساتھ پنجہ آزمائی کر کے محروم طبقات کو ان کے حقوق دلوانے ہوں تو وہاں ملٹری ڈسپلن کے بغیر کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس مرحلہ پر تو پھر بیعت سمع وطاعت کی اساس پر تشکیل شدہ جماعت ہی مثبت نتائج برآمد کر سکتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد کسی بھی داعی کی بیعت میں بنیادی فرق یہ ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ کی بیعت مطلق تھی جبکہ اب جو جماعت بھی یہ بیڑا اٹھائے اس کے قائد کے ہاتھ پر یہ بیعت فی المعروف کی قید کے ساتھ ہوگی' یعنی یہ اطاعت قرآن وسنت کے دائرہ کے اندر ہوگی۔

یہ ہے تنظیم اسلامی کا تعارف اور اس کی دعوت — یعنی بندگیٔ ربّ کی دعوت اور اس بندگی پر مبنی نظام کے قائم کرنے کی جدوجہد۔ اس کے لئے ضروری ہے ایک ایسی جماعت جس کی تشکیل بیعت کے مسنون اصول پر ہو اور یہ مرحلہ وار مسلسل جہاد میں مصروف رہے۔ ربّ کریم ہمیں ان اصولوں پر قائم رکھے اور اس محنت میں زیادہ سے زیادہ خلوص کی دولت عطا فرمائے! (آمین یاربّ العالمین)

بقیہ: ظروف واحوال

دے دیا جائے اور یوں مذہبی انتہا پسندی کا بہانہ بنا کر ایٹمی تنصیبات پر قبضہ کر لیا جائے۔ کیونکہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت دشمنانِ دین وملک وقوم کی آنکھوں میں بری طرح کھٹک رہی ہے۔ پاکستان کو امریکہ اور بھارت کا تابع مہمل بنانا ملک وقوم کے مفاد میں نہیں ہے۔ پاکستان کے استحکام اور بقا کے حصول کا واحد راستہ یہاں نظام خلافت کے قیام کا ہے کہ جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا۔

مسلمان کا طرزِ حیات (۲۱)

علامہ ابو بکر الجزائری کی شہرۂ آفاق تالیف

"منہاجُ المُسلم" کا اردو ترجمہ

مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

کتاب الآداب

پانچواں باب

نفس کے آداب

ایک مسلمان آدمی یقین رکھتا ہے کہ اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد والی زندگی میں بھی اس کی خوش بختی کا دارومدار اس کے نفس کی صفائی' پاکیزگی اور ادب میں ہے۔ اسی طرح نفس کی خرابی اور خُبث کا نتیجہ بدنصیبی ہے۔ اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔

ارشادِ خداوندی ہے :

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○ ﴾ (الشمس : ۹'۱۰)

" کامیاب ہوا جس نے نفس کو پاک کرلیا' اور ناکام ہوا جو اسے پستی کی طرف لے گیا۔"

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ○ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۡ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ ﴾ (الاعراف : ۴۰ ـ ۴۲)

"بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان (کو قبول کرنے) سے تکبر کیا' ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے' نہ وہ جنت میں داخل ہوں

گے حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے۔ ہم مجرموں کو اسی طرح بدلہ دیں گے۔ ان کے لیے جہنم کے بچھونے ہوں گے اور ان کے اوپر (جہنم کے) لحاف ہوں گے۔ ہم ظالموں کو یوں ہی بدلہ دیں گے۔ اور جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک کام کیے تو ہم کسی جان پر اس کی طاقت سے بڑھ کر ذمہ داری نہیں ڈالتے' یہ لوگ جنت والے ہیں' وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔"

اس کے علاوہ ارشاد ہے:

﴿ وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○ ﴾ (العصر: ۱-۳)

"زمانہ گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے' سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر (اور ثابت قدمی) کی تلقین کی۔"

جنابِ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((کُلُّ اُمَّتِیْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰی)) قَالُوْا: وَمَنْ یَّاْبٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰی)) [1]

"میری تمام اُمت جنت میں داخل ہو جائے گی مگر جس نے انکار کیا (وہ داخل نہیں ہو گا)"۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول (جنت میں داخل ہونے سے) کون انکار کرے گا؟ تو آنحضور ﷺ نے فرمایا: "جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو جائے گا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا"۔

آنحضرت ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے:

((کُلُّ النَّاسِ یَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا)) [2]

"ہر شخص صبح کے وقت اپنی جان کا سودا کرتا ہے' پھر کوئی تو (نیک عمل کر کے) اسے آزاد کر لیتا ہے اور کوئی (برے اعمال کر کے) اسے ہلاک کر دیتا ہے"۔

مؤمن یقین رکھتا ہے کہ نفس کی پاکیزگی اور ترقی ایمان اور عمل صالح کے ذریعے ہوتی ہے اور اس کی خرابی اور تنزل کا سبب کفر اور گناہ کے کام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ﴾ (ھود: ۱۱۴)

"دن کے دونوں کناروں میں اور رات کی گھڑیوں میں نماز قائم کیجئے۔ بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔"

اور فرمایا:

﴿ بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ ﴾ (المطففین : ۱۴)

"بلکہ ان کے دلوں پر ان اعمال نے زنگ لگا دیا ہے جو وہ کیا کرتے تھے۔"

جنابِ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

((اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ ذَنْبًا كَانَ نُكْتَةً سَوْدَاءَ فِيْ قَلْبِهٖ فَاِنْ تَابَ وَنَزَعَ وَاسْتَعْتَبَ صُقِلَ قَلْبُهٗ وَاِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰى تَعْلُوَ قَلْبَهٗ)) (۳)

"مؤمن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کرلے اور باز آجائے اور نادم ہو تو اس کا دل صیقل ہو جاتا ہے' اور اگر مزید گناہ کرے تو سیاہ نقطہ بھی زیادہ ہو جاتا ہے' حتیٰ کہ اس کے دل پر پوری طرح چھا جاتا ہے"۔

قرآن کی درج بالا دوسری آیت میں اسی زنگ کا ذکر ہے:

﴿ كَلَّا ۜ بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ ﴾

(المطففین : ۱۴)

"ہرگز نہیں! بلکہ جو کام یہ کرتے ہیں ان کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے"۔

ارشادِ نبویؐ ہے:

((اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُمَا كُنْتَ وَاَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا' وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ)) (۴)

"تو جہاں بھی ہو اللہ سے ڈرتا رہ' اور گناہ کے بعد نیکی کرلے' وہ اسے مٹا دے گی' اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آ"۔

اس لیے مسلمان زندگی بھر نیک اعمال کرتا رہتا ہے تاکہ اپنے نفس کو پاک کرے اور اسے ادب سکھائے۔ کیونکہ سب سے زیادہ جسے ادب سکھانے کی ضرورت ہے وہ انسان کا اپنا نفس ہے۔ اس لیے مسلمان ایسے آداب پر عمل کرتا ہے جن سے نفس کا تزکیہ

ہو اور وہ ہر قسم کے تلوثات سے پاک ہو جائے۔ اسی طرح وہ ان تمام چیزوں سے نفس کو محفوظ رکھتا ہے جو اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنیں یا اس کی خرابی کا باعث ہوں' مثلاً غلط عقائد' بری باتیں اور برے افعال۔ وہ رات دن اس سے مجاہدہ کرتا ہے اور ہر گھڑی اس کا محاسبہ کرتا ہے۔ اسے نیکی کرنے پر مجبور کرتا ہے اور برائی کی طرف سے اسے سختی سے ہٹالیتا ہے۔ وہ اس کی اصلاح اور تادیب کے لیے اور اسے پاک کرنے اور ترقی دینے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کرتا ہے:

(ا) توبہ: توبہ کا مطلب ہے تمام گناہوں اور برائیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا' سابقہ گناہوں پر نادم ہونا اور آئندہ زندگی میں دوبارہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا ۖ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُكَفِّرَ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ... ﴾

(التحریم: ۸)

"اے مؤمنو! اللہ کے حضور خالص توبہ کرو' امید ہے کہ تمہارا مالک تمہارے بُرے کام معاف کردے گا اور تمہیں ان باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں....."

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ ﴾

(النُّور: ۳۱)

"اے مؤمنو! سب کے سب اللہ کے آگے توبہ کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔"

جنابِ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ تُوبُوا إِلَى اللَّهِ فَإِنِّي أَتُوبُ إِلَى اللَّهِ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ)) (۵)

"اے لوگو! اللہ کے آگے توبہ کرو۔ میں خود ایک دن میں سو بار اللہ کے حضور توبہ کرتا ہوں"۔

ایک حدیث میں فرمایا:

((مَنْ تَابَ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ)) (۶)

"جو شخص سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے توبہ کرلے' اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتے ہیں"۔

اور فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَبْسُطُ يَدَهُ بِاللَّيْلِ لِيَتُوْبَ مُسِيْءُ النَّهَارِ وَيَبْسُطُ يَدَهُ بِالنَّهَارِ لِيَتُوْبَ مُسِيْءُ اللَّيْلِ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَّغْرِبِهَا)) (۷)

"اللہ عزوجل رات کو اپنا ہاتھ پھیلاتے ہیں تاکہ دن میں گناہ کرنے والا توبہ کرلے' اور دن میں اپنا ہاتھ پھیلاتے ہیں تاکہ رات میں گناہ کرنے والا توبہ کرلے۔ (اللہ کی یہ رحمت مسلسل جاری رہے گی) حتیٰ کہ سورج مغرب سے طلوع ہوجائے"۔

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَلّٰهُ اَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهِ الْمُؤْمِنِ مِنْ رَجُلٍ فِيْ اَرْضٍ دَوِيَّةٍ مُهْلِكَةٍ مَعَهُ رَاحِلَتُهُ عَلَيْهَا طَعَامُهُ وَشَرَابُهُ ' فَنَامَ فَاسْتَيْقَظَ وَقَدْ ذَهَبَتْ ' فَطَلَبَهَا حَتّٰى اَدْرَكَهُ الْعَطَشُ ' ثُمَّ قَالَ: اَرْجِعُ اِلٰى مَكَانِيَ الَّذِيْ كُنْتُ فِيْهِ فَاَنَامُ حَتّٰى اَمُوْتَ ' فَوَضَعَ رَاْسَهُ عَلٰى سَاعِدِهِ لِيَمُوْتَ ' فَاسْتَيْقَظَ وَعِنْدَهُ رَاحِلَتُهُ وَعَلَيْهِ زَادُهُ وَطَعَامُهُ وَشَرَابُهُ ' فَاللّٰهُ اَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ الْعَبْدِ الْمُؤْمِنِ مِنْ هٰذَا بِرَاحِلَتِهِ وَزَادِهِ)) (۸)

"اللہ تعالیٰ کو اپنے مؤمن بندے کی توبہ کی وجہ سے اس شخص سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جو ایک چٹیل زمین میں سفر کر رہا تھا جہاں (بغیر کھانے پانی کے سفر کرنے والے کو) ہلاکت کا اندیشہ تھا۔ اس شخص کے پاس سواری کا جانور تھا جس پر اس کا کھانے پینے کا سامان لدا ہوا تھا۔ وہ سوگیا' جب جاگا تو سواری کا جانور گم ہوچکا تھا۔ وہ اسے ڈھونڈتا رہا حتیٰ کہ پیاس لگ گئی۔ اس نے کہا میں تو وہیں چلا جاتا ہوں جہاں میں (پہلے سویا ہوا) تھا۔ میں وہاں سو جاؤں گا حتیٰ کہ مجھے موت آجائے۔ وہ اپنے بازو پر سر رکھ کر لیٹ گیا تاکہ اسے موت آجائے۔ (اچانک) اس کی آنکھ کھلی تو اس کا جانور اس کے پاس (واپس آچکا) تھا۔ اس پر زادِ راہ اور کھانا پینا (سب کچھ) موجود تھا۔ تو اللہ کو مؤمن بندے کی توبہ سے کہیں زیادہ خوشی

ہوتی ہے اس شخص سے جو اپنی سواری اور زادِ راہ پاکر خوش ہوتا ہے"۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ "جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کی تو فرشتوں نے اس پر انہیں مبارک باد دی"۔ (۹)

(ب) **مراقبہ**: یعنی مسلمان اپنے نفس کو یہ یقین دلائے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ زندگی کے ہر لحظہ میں نفس کو یہی سمجھاتا رہے حتیٰ کہ اسے یقین آجائے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے' اس کے رازوں سے واقف ہے اور اس کے اعمال اللہ کی نظر میں ہیں۔ اس طرح نفس اللہ تعالیٰ کے جلال اور کمال کے مشاہدہ میں مستغرق ہو جائے گا' اسے اللہ کے ذکر میں اُنس محسوس ہوگا' اس کی اطاعت میں راحت ملے گی' اس کی توجہ ماسویٰ اللہ سے ہٹ کر محض حق تعالیٰ کی طرف مبذول ہو جائے گی۔ قرآنِ مجید میں چہرے کو اللہ کا مطیع کر دینے کا جو حکم وارد ہے اس کا یہی مطلب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ ... ﴾

(النّسآء: ۱۲۵)

"اس سے اچھا دین کس کا ہے جو اپنے چہرے کو اللہ کا مطیع کر دے اور احسان کی روش اختیار کیے ہوئے ہو...."

نیز ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ﴾ (لقمان: ۲۲)

"جو اپنے چہرے کو اللہ کا مطیع کر دے اور وہ احسان کا رویہ اختیار کرنے والا ہو تو اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا۔"

دیگر آیات میں اللہ تعالیٰ نے اسی مراقبہ کا حکم دیا۔ مثلاً:

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ﴾

(البقرۃ: ۲۳۵)

"اور جان لو کہ اللہ تمہارے دلوں کی باتیں جانتا ہے لہٰذا اس سے ڈرو۔"

اور فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ○ ﴾ (النّساء: ۱)

"اللہ تعالیٰ یقیناً تم پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔"

اور فرمایا:

﴿ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ﴾ (یونس: ۶۱)

"(اے نبی ﷺ!) آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور جو قرآن سے پڑھتے ہیں اور (اے مؤمنو!) تم جو عمل بھی کرتے ہو تو ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں جب تم اس میں مشغول ہوتے ہو۔"

جنابِ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ)) (۱۰)

"(احسان یہ ہے) کہ تُو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ تُو اسے دیکھ رہا ہے' اگر تُو اسے نہیں دیکھتا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے"۔

اُمت کے سلف صالحین کا یہی طریقہ تھا جس پر وہ کاربند رہے' انہوں نے اپنے نفسوں کا اس طرح محاسبہ اور نگرانی کی کہ انہیں "یقین" کا درجہ حاصل ہو گیا اور وہ مقربین کے مقام سے مشرف ہو گئے۔ ان سے منقول روایات سے یہی چیز واضح ہوتی ہے۔ بطورِ مثال ان کے چند ارشادات پیش کئے جاتے ہیں:

(۱) جنید رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: نظر نیچی رکھنے میں کون سی چیز مدد دے سکتی ہے؟ فرمایا: کہ تجھے یہ علم ہو کہ جب تُو کسی کی طرف دیکھتا ہے تو دیکھنے والا (اللہ) اس سے پہلے تیری طرف دیکھ رہا ہوتا ہے۔

(۲) سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس ہستی کو پیش نظر رکھو جس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ اور امید اس سے رکھو جس کے قبضہ میں حاجت روائی ہے اور اس سے ڈرتے رہو جسے سزا دینے کا پورا اختیار حاصل ہے۔

(۳) عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے ایک صاحب سے کہا: اے فلاں! اللہ کو دھیان میں رکھ۔ اس نے پوچھا: مراقبہ (اللہ کا دھیان رکھنے) کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: تمہاری کیفیت ہمیشہ اس طرح ہونی چاہیئے کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔

④ عبداللہ بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک مقام پر ہم رات گزارنے کے لیے ٹھہرے۔ اچانک ایک چرواہا پہاڑ سے اتر کر آیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: ان بکریوں میں سے ایک بکری ہمارے ہاتھ فروخت کردو۔ اس نے کہا: میں تو غلام ہوں (بکریوں کا مالک نہیں ہوں کہ فروخت کرسکوں)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آقا سے کہہ دینا کہ بھیڑیا کھا گیا تھا۔ غلام نے کہا: اللہ کہاں گیا؟ (وہ تو دیکھ رہا ہے)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے۔ وہ چرواہے کے آقا کے پاس گئے اور اس سے چرواہے کو خرید کر آزاد کردیا۔

⑤ کسی بزرگ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جو تیر اندازی کر رہے تھے اور ایک شخص ان سے الگ ہٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بزرگ اس کی طرف بڑھے کہ اس سے کوئی بات چیت کریں۔ وہ بولا: اللہ کا ذکر زیادہ مرغوب ہے۔ انہوں نے کہا: تم اکیلے ہو؟ اس نے کہا: میرے ساتھ میرا رب ہے اور دو فرشتے ہیں۔ انہوں نے کہا: ان لوگوں (تیر چلانے والوں) میں سے کون سبقت لے گیا ہے؟ اس نے کہا: جسے اللہ نے بخش دیا۔ انہوں نے کہا: راستہ کدھر ہے؟ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، پھر اُٹھ کر چلا گیا۔

⑥ کہتے ہیں جب زلیخا کو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خلوت میسر آئی تو اس نے اٹھ کر اپنے بُت کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ یوسف علیہ السلام نے کہا: کیا وجہ ہے تم ایک پتھر سے شرم کرتی ہو تو کیا میں اپنے زبردست رب سے حیا نہ کروں جو مجھے دیکھ رہا ہے؟

ایک شاعر کہتا ہے:

إِذَا مَا خَلَوْتَ الدَّهْرَ يَوْمًا فَلَا تَقُلْ
خَلَوْتُ، وَلٰكِنْ عَلَيَّ رَقِيبُ
وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ يَغْفُلُ سَاعَةً
وَلَا أَنَّ مَا تُخْفِي عَلَيْهِ يَغِيبُ
أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْيَوْمَ أَسْرَعُ ذَاهِبٍ
وَأَنَّ غَدًا لِلنَّاظِرِينَ قَرِيبُ

"جب تُو کسی دن کچھ وقت کے لیے تنہا ہو تو یہ نہ کہہ کہ مجھے تنہائی مل گئی' بلکہ یوں کہہ کہ میری نگرانی کرنے والی ایک ہستی بھی موجود ہے۔
تُو گھڑی بھر کے لیے بھی یہ گمان نہ کر کہ اللہ تعالیٰ غافل ہے' اور نہ یہ سمجھ کہ تو جس چیز کو چھپا رہا ہے وہ اس سے بھی پوشیدہ رہے گی۔
کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ آج کا دن کتنی تیزی سے گزر رہا ہے اور دیکھنے والوں کے لیے کل کا دن قریب ہے۔"

(ج) محاسبہ: چونکہ مسلمان اس دنیا میں رہتے ہوئے دن رات وہ کام کرتا ہے جس سے اسے آخرت میں خوش نصیبی حاصل ہو جائے اور وہ وہاں عزت و احترام کا مستحق ہو جائے اور اسے اللہ کی خوشنودی مل جائے' اور یہ دنیا اس کے کام کا وقت ہے' لہٰذا اسے چاہیئے کہ وہ فرض اعمال کو اس نظر سے دیکھے جس نظر سے ایک تاجر اپنے رأس المال کو دیکھتا ہے' اور نفلی اعمال کو سرمایہ کے علاوہ حاصل ہونے والا منافع خیال کرے' اور گناہوں کو تجارت میں خسارہ سمجھے۔ پھر روزانہ دن ختم ہونے پر اکیلا بیٹھ کر اس دن کے اعمال کا حساب کرے' اگر فرائض میں کوئی کمی کوتاہی نظر آئے تو نفس کو ملامت کرے اور فوراً وہ کمی پوری کرے۔ اگر وہ فرض ایسا ہے جس کی قضا دی جا سکتی ہے تو قضا دے۔ اگر وہ ایسا فرض ہے جس کی قضا ممکن نہیں ہے تو اس کی کمی کثرتِ نوافل سے پوری کرے۔ اگر نوافل میں نقص نظر آئے تو اس کمی کو پورا کرے۔ اگر معلوم ہو کہ ممنوع کام کے ارتکاب کی وجہ سے خسارہ ہو گیا ہے تو استغفار کرے' اپنے گناہوں پر نادم ہو' اللہ کی طرف توجہ کرے اور ایسی نیکیاں کرے جن سے یہ سمجھا جا سکے کہ اس خرابی کی اصلاح ہو گئی۔

محاسبہ سے یہی مراد ہے اور یہ نفس کی اصلاح' تادیب' تزکیہ اور تطہیر کا ایک طریقہ ہے۔ اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴾ (الحشر: ۱۸)

"اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ہر جان دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' یقیناً اللہ تمہارے عملوں سے باخبر ہے۔"

اس آیت میں ﴿ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ ﴾ کے الفاظ (یعنی ہر جان دیکھے) میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر نفس سے یہ حساب لیا جائے کہ اس نے اپنے مستقبل کے لیے کیا تیاری کی ہے اور آخرت میں کام آنے والے کون سے عمل کیے ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (النور: ۳۱)

"اے مؤمنو! سب کے سب اللہ کے حضور توبہ کرو تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو سکے۔"

جنابِ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنِّیْ لَاَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ وَاَسْتَغْفِرُهُ فِی الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ)) (۱۱)

"میں دن میں سو بار اللہ کے آگے توبہ کرتا ہوں اور اس سے مغفرت طلب کرتا ہوں"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: حَاسِبُوْا اَنْفُسَكُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا (۱۲) "اپنا محاسبہ کرو' پہلے اس کے کہ تمہارا حساب لیا جائے"۔ جب رات ہوتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے قدموں پر ضرب لگاتے اور اپنے آپ سے کہتے: آج تُو نے کیا عمل کیا؟ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ جب نماز کے دوران باغ کی طرف متوجہ ہو کر اس میں مشغول ہو گئے تو پورا باغ فی سبیل اللہ صدقہ کر دیا۔ اس کی وجہ محض محاسبۂ نفس اور اپنی تادیب تھا۔ اَحنف بن قیس چراغ کے پاس آکر اپنی انگلی اس (کی لو) پر رکھ دیتے تھے حتیٰ کہ آگ کا احساس ہوتا۔ پھر اپنے آپ سے فرماتے: ارے اَحنف! تُو نے فلاں دن فلاں کام کیوں کیا تھا؟ فلاں دن تُو نے یہ کام کیوں کیا تھا؟

کہتے ہیں کہ ایک مرد صالح جہاد میں شریک تھے' ان کے سامنے ایک عورت بے پردہ آگئی۔ ان کی نظر عورت کی طرف اٹھ گئی۔ چنانچہ انہوں نے تھپڑ مار کر اپنی آنکھ پھوڑ ڈالی اور بولے: تُو ایسی چیزوں کی طرف بہت دیکھتی ہے جن سے تجھے نقصان ہو"۔ ایک

بزرگ کا گزر ایک بالا خانہ کے پاس سے ہوا۔ کہنے لگے : یہ بالا خانہ کب تعمیر ہوا؟ پھر اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا : تُو مجھ سے ایسی باتیں پوچھتا ہے جن سے تیرا کوئی تعلق نہیں۔ میں تجھے ایک سال روزہ رکھنے کی سزا دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک سال روزہ رکھا۔ ایک بزرگ کے متعلق روایت ہے کہ وہ تپتی ریت پر لیٹتے تھے اور کہتے تھے : یہ چکھ اور جہنم کی آگ تو بہت گرم ہے۔ کیا تُو رات کو مردہ بن کر پڑا رہتا ہے اور دن کو بے کار رہتا ہے؟ ایک بزرگ نے ایک دن سر اٹھایا تو چھت پر ایک عورت نظر آئی' انہوں نے اس کی طرف دیکھ لیا۔ پھر (اس گناہ کے کفارہ کے طور پر) انہوں نے اپنے آپ سے وعدہ کر لیا کہ زندگی بھر آسمان کی طرف نہیں دیکھیں گے۔ (۱۳)

اس اُمت کے نیک لوگ اس طرح نفس کی کوتاہی پر اس کا محاسبہ کرتے اور اسے ملامت کرتے تھے' نفس کو تقویٰ پر مجبور کرتے اور خواہشات کی پیروی سے روکتے' تاکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر عمل ہو :

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ ﴾ (النّٰزعٰت : ۴۰'۴۱)

"اور جو کوئی اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اس نے نفس کو خواہشات سے روک لیا تو جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔"

(د) مجاہدہ : اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا سب سے بڑا دشمن اس کا نفس ہے' اور وہ فطری طور پر شر کی طرف مائل اور خیر سے گریزاں ہے اور برائی کا حکم دیتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے :

﴿ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ ... ﴾ (یوسف:۵۳)

"میں اپنے نفس کو بری نہیں سمجھتا۔ نفس تو برائی کا بہت زیادہ حکم دینے والا ہے"۔ (۱۴)

نفس راحت پسند ہے' بے کاری کی طرف راغب ہوتا ہے' خواہشات کے پیچھے چل پڑتا ہے' دنیا کی خواہشات اسے اپنی طرف مائل کر لیتی ہیں اگرچہ ان کا نتیجہ تباہی اور ہلاکت ہی ہو۔

جب مسلم اس حقیقت کو سمجھ جاتا ہے تو پھر نفس سے جہاد کے لیے تیار ہو جاتا ہے' وہ نفس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیتا ہے اور ہتھیار نکال لیتا ہے۔ وہ اس کی رعونت کا مقابلہ کرنے اور اسے (ناجائز) خواہشات سے روکنے کا پختہ ارادہ کر لیتا ہے۔ اگر نفس راحت پسند کرے تو وہ اسے خوب عبادت میں مشغول کرتا ہے اور جب وہ (ناجائز یا غیر معتدل) خواہشات کی طرف راغب ہو تو وہ اسے ان سے محروم رکھتا ہے۔ اگر وہ بھلائی یا اطاعت میں کوتاہی کرے تو اسے سزا دیتا اور ملامت کرتا ہے۔ پھر جس کام میں کوتاہی ہوئی ہے اسے پورا کرنے پر مجبور کرتا ہے' جو نیکی اس نے چھوڑی ہے اس کی قضا کا حکم دیتا ہے۔ وہ اسی طرح اس کی تربیت کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ پاک صاف ہو کر نفس مطمئنہ بن جاتا ہے۔ یہی جہادِ نفس کا مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾

(العنکبوت : ۶۹)

"اور جو ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ضرور ہی انہیں اپنی راہیں دکھا دیں گے' اور یقیناً اللہ تعالیٰ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

مسلمان اللہ کی رضا کے لیے اپنے نفس سے مجاہدہ کرتا ہے تاکہ وہ پاک صاف ہو کر نفس مطمئنہ کا مقام حاصل کر لے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی طرف سے عزت افزائی کا مستحق بن جائے۔ نیک لوگوں کا یہی طریقہ ہے اور سچے مؤمنوں کا یہی راستہ ہے۔ ان کی اقتداء کرتے ہوئے' ان کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے اس راستے پر چلنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ رات کو اتنا قیام کرتے تھے کہ پاؤں مبارک (ورم کی وجہ سے) پھٹنے لگتے۔ آپ ﷺ سے اس معاملے میں عرض کیا گیا تو ارشاد ہوا:

((اَفَلَا اُحِبُّ اَنْ اَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا؟)) (۱۵)

"کیا میں شکر گزار بندہ بننا پسند نہ کروں؟"

اس سے بڑھ کر اور کون سا مجاہدہ ہو سکتا ہے؟ جنابِ علی رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس طرح تعریف فرماتے ہیں: "اللہ کی قسم! میں نے محمد ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھا ہے۔ اب مجھے (کسی میں) ان سے ملتے جلتے اوصاف نظر نہیں آتے۔ صبح کے وقت ان کی یہ حالت

ہوتی تھی کہ پراگندہ بال' غبار آلود' زرد رُو۔ وہ اپنی راتیں سجدے کرتے ہوئے اور قیام میں کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہوئے گزار دیتے تھے۔ جب اللہ کا نام لیا جاتا تو اس طرح کانپتے جس طرح ہوا چلنے سے درخت (کے پتے) ہلتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی حتیٰ کہ ان کے کپڑے تر ہو جاتے۔"

ابو درداء رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: "اگر تین چیزیں نہ ہوتیں تو میں ایک دن بھی زندہ رہنے کی خواہش نہ کرتا: دوپہر کو اللہ کی رضا کے لیے پیاس برداشت کرنا' آدھی رات کو اس کے حضور سربسجود ہونا اور ایسے حضرات کی مجلس جو صرف اچھی باتیں کرتے ہیں جس طرح لوگ اچھے پھل چن لیتے ہیں"۔ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نمازِ عصر جماعت سے ادا نہ کر سکے تو انہوں نے اپنے نفس کو سختی سے تنبیہہ کی' اور اس مقصد کے لیے دو لاکھ درہم کی قیمت کا قطعۂ زمین صدقہ کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اگر کبھی نماز باجماعت سے پیچھے رہ جاتے تو (اس کی تلافی کے لیے) پوری رات عبادت میں گزار دیتے۔ ایک بار مغرب کی نماز ادا کرنے میں اتنی دیر ہو گئی کہ دو ستارے آسمان پر نظر آنے لگے۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے دو غلام آزاد کیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: "اللہ تعالیٰ ان حضرات پر رحمت فرمائے جنہیں لوگ بیمار سمجھتے ہیں حالانکہ وہ بیمار نہیں ہوتے"۔ یعنی نفس سے مجاہدہ کی وجہ سے بیمار معلوم ہوتے تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

((خَيْرُ النَّاسِ مَنْ طَالَ عُمُرُهُ وَحَسُنَ عَمَلُهُ)) (۱۶)

"بہتر انسان وہ ہے جس کی عمر لمبی ہو اور اس کے عمل نیک ہوں"۔

اُویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کہتے: "آج کی رات رکوع کی رات ہے" پھر پوری رات رکوع میں گزار دیتے۔ اگلی رات فرماتے: "آج کی رات سجدہ کی رات ہے" پھر پوری رات سجدہ میں گزار دیتے۔ (۱۷) ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: "میں نے ایسے حضرات بھی دیکھے ہیں کہ کثرتِ صلوٰۃ کی وجہ سے ان کے قدموں میں چلنے کی طاقت نہیں رہتی تھی' حتیٰ کہ گھسٹ کر بستر تک پہنچتے۔ اور کسی کی یہ حالت تھی کہ طویل قیام کی وجہ سے پاؤں متورّم ہو جاتے تھے اور عبادت میں اتنی محنت کرتے تھے کہ اگر انہیں خبر ملتی کہ قیامت کل ہی قائم ہونے والی ہے تو عبادت میں اضافہ کی گنجائش نہ ہوتی۔ وہ سردی کے موسم میں چھت

پر تہجد پڑھتے تاکہ ٹھنڈی ہوا نیند سے محفوظ رکھے اور گرمیوں میں کمرے کے اندر تہجد پڑھتے تاکہ گرمی کی وجہ سے نیند نہ آئے۔ اور کسی کی کیفیت یہ تھی کہ سجدہ کی حالت میں روح پرواز کر گئی"۔

مسروق رحمۃ اللہ علیہ کی زوجہ محترمہ بیان فرماتی ہیں کہ مسروقؒ کی پنڈلیاں کثرتِ قیام کی وجہ سے ہمیشہ متورّم رہتی تھیں، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہوتے اور مجھے ان کی حالت دیکھ کر ترس آتا اور میں رو پڑتی۔

بعض حضرات سے منقول ہے کہ جب ان کی عمر چالیس سال کی ہو گئی تو انہوں نے بستر لپیٹ دیا، اس کے بعد کبھی بستر پر نہ سوئے۔ [۱۸] روایت ہے کہ ایک نابینا خاتون بہت نیک تھیں۔ ان کا نام عجرہ تھا۔ جب رات کا آخری حصہ ہوتا تو بہت غمگین آواز میں فرماتیں: "اے اللہ! عبادت کرنے والوں نے تیرے لیے تاریک راتوں کی مسافت طے کی ہے، وہ تیری رحمت اور مغفرت کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ الٰہی میں صرف تیری ذات کا واسطہ دے کر سوال کرتی ہوں کہ مجھے سابقین کی پہلی جماعت میں شامل فرمادے، اور عِلِّیِّین میں میرا درجہ بلند فرما کر مقربین میں شامل فرما اور مجھے اپنے نیک بندوں کے ساتھ ملادے۔ تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحیم ہے، سب عظمت والوں سے بڑھ کر عظیم ہے، سب کریموں سے بڑا کریم ہے۔ یا کریم!" اس کے بعد سجدہ میں گر پڑتیں اور طلوعِ فجر تک دعا اور گریہ زاری میں مشغول رہتیں۔

حواشی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاعتصام، باب الاقتداء بسنن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ فاضل مولف نے حدیث کے الفاظ ((کُلُّکُمْ یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ....)) درج کئے ہیں جو ہمیں کتب حدیث میں نہیں ملے۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب فضل الوضوء

(۳) سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب ذکر الذنوب، وجامع الترمذی، کتاب التفسیر، باب سورۃ ویل للمطففین۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو "حسن صحیح" کہا ہے۔

(۴) مسند احمد۔ وسنن الترمذی، کتاب البر، باب ماجاء فی معاشرۃ الناس۔

(۵) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب استحباب

الاستغفار والاستكثار منه۔

(۶) صحيح مسلم' كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار ' باب استحباب الاستغفار والاستكثار منه۔

(۷) صحيح مسلم' كتاب التوبة' باب قبول التوبة من الذنوب وان تكررت الذنوب والتوبة۔

(۸) صحيح البخاری' كتاب الدعوات' باب التوبة (بالمعنى) ۔ وصحيح مسلم ' كتاب التوبة' باب فی الحض على التوبة والفرح بها۔

(۹) احياء العلوم' غزالیؒ

(۱۰) صحيح البخاری' كتاب الايمان' باب سوال جبريل النبی صلى الله عليه وسلم عن الايمان والاسلام والاحسان۔ وصحيح مسلم' كتاب الايمان' باب بيان الايمان والاسلام والاحسان۔

(۱۱) صحیح مسلم میں الفاظ کے کچھ فرق سے مروی ہے۔ دیکھئے: صحيح مسلم' كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار' باب استحباب الاستغفار والاستكثار منه۔

(۱۲) جامع الترمذی' كتاب صفة القيامة والرقائق والورع' باب ۲۵۔ اس معنی میں ترمذی (باب ہذا) میں حسن سند کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے: ((اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ....)) "عقل مند وہ ہے جو اپنا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے...."

(۱۳) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محاسبۂ نفس فرماتے تھے لیکن وہ صوفیاء کی طرح غلو کا شکار نہیں تھے۔ جب کوئی غلطی ہو جاتی نادم ہوتے اور توبہ کرتے اور حسب معمول زندگی گزارتے۔ ایک صحابی نے عرض کیا: حضور ﷺ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے' مجھ پر حد نافذ کیجئے۔ آنحضور ﷺ نے سمجھ لیا کہ یہ غلطی حد کی موجب نہیں ہے' چنانچہ اسے کچھ نہیں کہا' حتیٰ کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ اس صحابی نے بھی حضور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی اور پھر اپنی عرض دہرائی۔ آنحضور ﷺ نے اسے بتایا کہ نماز کی وجہ سے تمہاری غلطی معاف ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صحابی اپنی غلطی پر سخت نادم اور پریشان تھے حتیٰ کہ سزا برداشت کرنے کے لئے تیار تھے۔ لہٰذا جب اس قلبی توبہ کے ساتھ نماز جیسی عظیم نیکی بھی مل گئی تو گناہ معاف ہو گیا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے مسلسل روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ تہجد کی نماز کے متعلق فرمایا کہ جب تک طبیعت میں نشاط ہو نماز پڑھو' جب تھکن محسوس کرو تو سو جاؤ۔ بلکہ جن صحابہ کرام نے ہمیشہ روزہ رکھنے' ہمیشہ رات بھر تہجد پڑھنے اور شادی نہ کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا آنحضور ﷺ نے ان پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ (مترجم)

(۱۴) عام طور پر اسے حضرت یوسف علیہ السلام کا قول سمجھا جاتا ہے۔ لیکن بعض علماء نے اسے عزیز مصر کی بیوی کا کلام قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم (مترجم)

(۱۵) صحیح البخاری' کتاب التهجد' باب قیام النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم حتی ترم قدماه ۔ وصحیح مسلم' کتاب صفات المنافقین و احکامهم ' باب اکثار الاعمال والاجتهاد فی العبادة۔

(۱۶) جامع الترمذی' کتاب الزهد' باب ما جاء فی طول عمر المؤمن۔ الفاظ کے کچھ فرق سے مروی ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

(۱۷) یہ تمام روایات امام غزالی نے احیاء العلوم میں نقل کی ہیں۔ اور احیاء العلوم میں بہت سی روایات ضعیف بھی ہیں۔

(۱۸) حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے وفات تک ازواج مطہرات کے حقوق ادا کئے اور بستر پر بھی سوتے رہتے۔ البتہ تکلف نہیں کیا کہ بغیر بستر کے سو نہ سکیں۔ زمین پر بھی سو جاتے تھے۔ اصل مجاہدہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی زیادہ سے زیادہ تعمیل اور سنت نبوی پر افراط و تفریط کے بغیر کاربند ہونے کا نام ہے۔ (مترجم)

بقیہ: عرضِ احوال

۱) پورے دستور میں جہاں بھی کوئی شے دستور کی دفعہ ۲ ـ الف (قرارداد مقاصد) کے منافی ہے اسے یا خارج کر دیا جائے یا صراحتاً قرارداد مقاصد کے تابع کیا جائے۔

۲) دفعہ ۲ ہی میں شق (ب) کا اضافہ کیا جائے کہ: ''پاکستان میں وفاقی' صوبائی' ضلعی یا کسی بھی سطح پر کوئی قانون سازی کُلی یا جزوی طور پر کتاب و سنت کے منافی نہیں کی جاسکے گی''۔

۳) دستور کی دفعہ ۲۰۳ (ب) کی ذیلی شق (ج) کے ذریعے فیڈرل شریعت کورٹ کے دائرہ کار سے جو استثناء دستور پاکستان' مسلم پرسنل لاء اور جوڈیشل لاز کو دیا گیا ہے اسے ختم کیا جائے۔

۴) وفاقی شرعی عدالت کے ججوں کی شرائط ملازمت کو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کے مساوی بنایا جائے تاکہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مکمل طور پر آزاد ہوں!''

قارئین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل زیر نظر شمارہ ماہ مارچ اپریل کا مشترکہ شمارہ ہے۔

بقیہ: حکمت دعوت

۲۱) سید اسعد گیلانی، رسول اکرم ﷺ کی حکمت انقلاب، ص ٤٦٧، معراج الدین پرنٹرز، ادارہ ترجمان القران لاہور، ۱۹۹۵ء

۲۲) البخاری، عبد اللّٰہ محمد بن اسماعیل، الامام، الجامع الصحیح البخاری، ج ۱، ص ۳۹، دار ابن کثیر، دمشق، الطبعة الاولی ۱٤۱۰ھ/ ۱۹۹۰ء

۲۳) ابوعیسیٰ، محمد بن عیسیٰ بن سورہ، سنن الترمذی، ج ٥، ص ۲۸، دار العمران بیروت، بدون تاریخ

۲٤) العجلونی، اسماعیل بن محمد الجیراجی، کشف الخفاء و مزیل الالباس، ج ۱، ص ۲۰۰، مکتبة الغزالی دِمشق، بدون تاریخ

۲٥) احمد بن حنبل، مسند الامام احمد بن حنبل، ج٦، ص ٤۳٤۲، ٤٦٥۱ تحقیق احمد محمد شاکر، دار المعارف بمصر ۱۳۷۷ھ/۱۹٥۸ء

۲٦) نیسابوری، الامام ابی الحسین، مسلم بن الحجاج، ابن مسلم القشیری، الجامع الصحیح، ج۳، ٦، ص ۱۰۰، دار الفکر بیروت بدون تاریخ۔ واحمد بن حنبل، مسند، ج٥، ص۳٤٤۸۔ والبخاری، الجامع الصحیح، ج۲، ص ٦۲۲

۲۷) سید سلیمان ندوی، شبلی نعمانی، سیرت النبی ﷺ، ج٤، ص ۱۸۸، مکتبہ مدینہ لاہور ۱٤۰۸ھ

۲۸) سید اسعد گیلانی، رسول اکرم ﷺ کی حکمت انقلاب، ص ٤۷۲

۲۹) سید اسعد گیلانی، رسول اکرم ﷺ کی حکمت انقلاب، ص ٤۷۲، ٤۷۳

۳۰) حافظ احمد یار، مضامین قرآن، ص ۲۰۱، الائیڈ بک سنٹر، ۱۹۹۹ء

۳۱) مودودی، سید، دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات، ص ۱۳ تا ۱٥، اسلامک پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹٤ء

۳۲) الازہری، پیر محمد کرم شاہ، ضیاء القرآن، ج٤، ص ۳٤۷ تا ۳٤۸ ضیاء القرآن پبلیکیشنز لاہور ۱۳۹۹ھ

۳۳) آزاد، ابوالکلام، احکام القرآن، ج۳، ص ۳۲۳، زاہد پبلیکیشنز لاہور ۱۹۸٦ء

۳٤) مجددی، قاضی ثناء اللّٰہ عثمانی پانی پتی، علامہ، تفسیر مظہری، ج ۱۰، ص ۲۸۲، دار الاشاعت کراچی، بدون تاریخ

۳٥) اصلاحی، صدر الدین، مولانا، فریضہ اقامت دین، ص ۹۳، اسلامک پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۰ء

۳٦) بنت الاسلام، داعی کے اوصاف، ص ۹۹، ادارہ بتول لاہور ۱۹۸۹۔۱۹۹۰ء

۳۷) مودودی، مولانا، سیرت سرور عالم، ج۲، ص ۱٦۷ تا ۱۷٥۔ ادارہ ترجمان القرآن، اشاعت پنجم ۱۹۸۹ء